

جاسوسی دنیا نمبر 29

لاشون کا آپسشار

(مکمل ناول)

الف لیلی کی ایک رات

ہلکی سر دیوں کی ایک خوشنگوار رات تھی لیکن یہ خوشنگواری اُسی وقت تک قائم رہی جب تک
رجٹ حید کو راستہ بھلک جانے کا احساس نہیں ہوا۔ وہ سر شام ہی دلاور نگر سے چل پڑا تھا۔ کام
پکھ اتنا ہی ضروری تھا کہ اس نے ٹرین کے وقت کا انتظار کرنے کے بجائے فریدی کی کار استعمال
کی تھی۔ واپسی پر شام ہو گئی۔ تھوڑی دور تو وہ پتہ سڑک سے آیا پھر اس خیال سے کہ سفر مختصر
ہو سکے اس نے ایک جگہ کار کو ایک پکھ راستے پر موڑ دیا۔ یہ اس نے اپنی یادداشت کے بھروسے پر
کیا تھا۔ اس کی داشت میں ایک بار فریدی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بہر حال حید کو یقین تھا کہ اس
نے کار غلط راستے پر نہیں موڑی تھی۔

اُسے شہر پہنچنے کی پکھ اتنی جلدی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کیڈ لاک جیسی شاندار
گاڑیاں پکھ راستوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مطلع غبار آکوڈ ہونے کی وجہ سے چاندنی ہلکی تھی اور جنگل کے نائے سے اس کی ہم آہنگی
بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ حید سوچ رہا تھا کہ اگر رفیق سفر تھائی نہ ہوتی تو اس وقت کیڈی کے
پیوں کے نیچے کی تاہموار زمین نہ جانے کتنے جہانوں کی سیر کرادیتی اس وسیع کائنات کے رشتے
میں پروئے ہوئے دودلوں کے کتنے راز فاش ہوتے۔ اس کے ذہن کی سطح پر کئی حسین چہرے اُبھر
آئے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے گرد بکھری ہوئی بیکار خوبصورتی کا ایک حصہ بنانے کے
لئے منتخب کرنے لگا۔

بہر حال اس کا ذہن شاعران خیالات کی وادیوں میں بھکلتا رہا اور وہ خود جنگل میں..... جب
کافی دیر ہو گئی اور وہ بد گد کا عظیم ایشان درخت نہ ملا جہاں سے اسے باہمیں طرف مڑنا تھا تو اچانک

وہ سارے شاعر انہ خیالات سرا سینگی کی دلدل میں جا پھنسے۔ اس دوران میں نہ تو اسے وقت، احساس رہ گیا تھا اور نہ بھی دھیان تھا کہ سڑک سے کتنا فاصلہ طے کرچکا ہے۔ کیڈی کے انجن سے کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے پانی تھوڑا ہی رہ گیا ہو۔ پڑول تو خیر نیکی میں کافی تھا اور کار کے پچھے حصے میں بھی کئی میں بھرے رکھے تھے۔

اس نے کار روک دی لیکن انجمن بند نہیں کیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر کار اسی طرف ہوا۔ دی جدھر سے آیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اسے دوراستے نظر آئے جو مختلف سمتوں میں چلے گئے تھے اور ان کے درمیان گھنا جنگل تھا۔ حمید کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ ان میں سے کس راستے سے آیا تھا۔ اس نے یچے اتر کر پہبیوں کے نشانات دیکھنے شروع کئے لیکن بد قسمی سے زیاد اتنی سخت تھی کہ وہ نشانات نہ ملنے پر اس میں سما بھی تو نہیں سکتا تھا اور آسمان تو خیر ازال سے ہو دو رہے۔

اس کی بیکھر میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنے۔ آخر کار اس نے جیپ ٹھوٹ کر ایک روپیہ نالا اور دونوں را ہوں کوڑہن میں رکھ کر ناس کیا۔ روپیہ آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور وہ جھک کر دیکھنے لگا۔

”ہمید...!“ وہ آہستہ سے بڑھایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ تن بہ تقدیر ایک راستے پر ہو لیا۔

کچھ دیر پہلے کی حسین چاندنی کفن یا کسی مقدس کنواری کی طرح بور لکھے گئی تھی۔ روپیہ چادر اور سنائی کار بٹ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ حسین چہرے جو کچھ دیر قبل ذہن کی سطح پر ابھرے تھے جھلاہٹ کے غبار میں چھپ گئے اور وہ پختہ سڑک! وہ آدھ گھنٹہ چلتے رہنے کے باوجود بھی نہ ملی۔

کیڈی کا سنجیدہ ترین انجن پیاس سے بے قابو ہو کر شور مچانے لگا تھا۔

”شامت ہے شامت۔“ حمید نے بڑھا کر کیڈی روک دی۔

چند لمحے بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر یچے اتر آیا۔

پانی کا مسئلہ بہت ضروری تھا اور سہ بھلکنے کو کیا؟ دوچار گھنٹے اور سہی لیکن پانی ہی کہاں مل جائے۔ اگر وہ سڑک ہی سڑک چلا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کامیابی ضرور ہو جاتی۔ آتے وقت راستے میں اس نے کئی تالات دیکھے تھے مگر بیہاں جنگل میں اگر کوئی ہوتا بھی تو ضروری نہیں کہ اس کی رسائی

اس نک ہو ہی جاتی۔

وہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ دفعتاً اسے اپنے سامنے کچھ دور پر روشنی دکھائی دی جو کچھ راستے سے اٹھ کر سامنے کی جھاڑیوں پر پھیل گئی اور پھر ایک آواز سنائی دیئے گئی جو کسی سڑک ہی کے انجن کی ہو سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز رفتار سڑک جھاڑیوں سے نکل کر مخالف سمت میں رُز گیا۔ حمید سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سڑک ہی کی طرف سے آئی ہو۔

وہ پھر کیڈی میں جا بیٹھا اور اسی طرف چل پڑا جدھر سے سڑک آیا تھا۔ کچھ دور چلتے کے بعد اچانک اسے پھر رک جاتا پڑا۔ یا کہنے طرف ایک کشادہ راستہ تھا۔ صرف ہمارا بلکہ باقاعدہ دونوں طرف مالٹی کی گھنی جھاڑیاں تھیں لیکن خود رو نہیں۔ ان کی کاٹ چھانٹ اور باقاعدہ گی کسی آدمی کی مر ہون مخت تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے سلاخوں دار چانک پر ختم ہو گیا تھا جو بند نہیں تھا۔ مدھم چاندنی میں ایک سفیدی سی عمارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ حمید کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن کیڈی کے لئے پانی کی ضرورت نے اسے بڑھنے نہیں دیا۔ اس نے کار موڑی اور چانک نے گذر کر پائیں باغ میں پہنچ گیا۔ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پائیں باغ سے بھی بڑی کوئی چیز نہیں۔ جس کے درمیان میں ایک بڑی سی عمارت تھی لیکن طول و عرض کی مناسبت سے اس کی اوپر جائی غالباً بہت ہی کم تھی۔ سامنے ایک طویل بڑا آمدہ تھا جس میں بر قی قلعے روشن تھے۔ قریب ہی کہیں سے گھر گھر اہمٹ کی آواز آرہی تھی جو غالباً کسی زیادہ طاقت والے ڈائنا موم کی تھی۔

برآمدے کے سامنے والی روشن پر مڑنے کی بجائے حمید نے کیڈی اسی طرف روک دی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا اور آس پاس بھی کوئی نہ دکھائی دیا۔ حمید نے سوچا کہ اس جدید طرز کی عمارت میں جسے ڈائنا ہو کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے گھنٹی ضرور ہو گی۔ وہ کیڈی سے اتر ہی رہا تھا کہ دفعتاً اس کی آنکھیں چند ہیا گئیں۔

اگر یہ تشبیہ گھنی اور پرانی نہ ہوتی تو وہ یہی سوچتا کہ وہ چہرہ سیاہ پردے کی اوٹ سے اسی طرح لٹا چکیے بدی سے چاند نکل آئے سفید سلک کا لبلا بادھ مکورے لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس لبادے کے اوپر سیاہ بل کھائے ہوئے گیسوں میں ایک خوابیاں اور سلگتہ ہوا سا چہرہ جس کے خدو خال آنکھوں میں گد گدی پیدا کر رہے تھے اور جب وہ برآمدے کی رُذشی کی زد سے نکل کر

روش پر اتر آئی تو حندلی چاندنی میں گویا جان پڑ گئی۔
وہ حمید سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑی اس کے چہرے پر نظریں جاتے ہوئے تھی اور
کوایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے اپنے جسم کی میں چلتے چلتے دفتار گئی ہو۔
”آپ کون ہیں؟“ تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی اور حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاندنی
اٹھی ہو۔

”مم... مسافر...!“ وہ ہکا کر رہ گیا۔
”کیا چاہئے؟“ اس بار گھنٹیاں سی نجاحیں اور حمید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی
میں بھی بڑی سیکس اپیل ہے۔

”پانی...!“ حمید نے کیڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ختم ہو گیا ہے۔“
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے
لڑکی واپس چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ ہولے ہولے ہوا میں تیرتی چلی جا رہی ہو۔
حمدید نے جیب سے رومال نکال کر پہنچنے کی وہ بوندیں خلک کیں جو اس دوران میں اس
چہرے پر بھوت آئی تھیں۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ لڑکیوں کے معاملے میں با
اندازی ہی ہو۔ اس سے پہلے کبھی اسے کسی لڑکی کا قرب نہ نصیب ہوا ہو۔

تو ہزاری دیر بعد وہ پھر برآمدے میں دکھائی دی اور اس نے حمید کو اشارے سے بلایا۔
حمدید کے قدم لا کھڑا رہے تھے۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ
وہی لڑکی ہے جو کچھ دیر قبل اس کے قریب چاندنی میں کھڑی تھی؟ لباس تو وہی تھا لیکن شر
صورت کے معاملے میں اسے اپنی یادداشت پر پوچھا اعتماد تھا۔ یہ وہ لڑکی تو ہرگز نہیں تھو
کچھ دیر قبل اسکے خواس خسے پر بڑی طرح چھاگئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بھی خوبناک تھیں
”راستہ بھلک گئے ہو۔“ اس نے آہتہ سے پوچھا۔ آواز میں اتنی دلکشی نہیں تھی۔

”جی ہاں... کیا آپ براہ مریانی کا زار کے لئے پانی دلوں میں کیں گی۔“
”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آدمی ہو۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔
”جی...؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
”جی بتاؤ کیا تم آدمی ہو۔“ اس بار اس کی آواز شدت جذبات سے کپکار ہی تھی۔

”اس پر میں نے ابھی تک غور ہی نہیں کیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر پانی...!...“
”آپ کھانا بھی میرے ہی ساتھ کھائیں گے۔“ لڑکی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں نے
ٹائی پچاس سال بعد آدمی دیکھا ہے۔“
یہ سن کر حمید کو بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے لئے یہ خیال بھی تو ہیں آمیز تھا کہ کوئی لڑکی
اٹھے گھس رہی ہو۔

”بیت تو آپ مجھے دیر تک دیکھئے۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“ لڑکی نے حمید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔
”ڈومبا ستر...!“ حمید بولا۔ ”اور آپ کا۔“

”کنوں؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ایک تالاب میں اُگی تھی۔“
حمدید بدققت تمام ہنسی ضبط کر کے بولا۔ ”اور... میں... مجھے کچھ شکاری ہمالیہ پہاڑ سے پکڑ
لائے تھے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔“

”ہمالیہ پہاڑ سے؟“ لڑکی نے پر اشتیاق لبھ میں کہا۔ ”اندر چلو... یا میہیں میٹھ جاؤ۔“
حمدید نے وہیں بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہاں تو تم کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔
حمدید چند لمحے غور سے اُسے دیکھتا ہاپھر بولا۔ ”کیا آپ کے والد صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔“

”والد صاحب کیا ہوتا ہے؟“
”بہت بُرا ہوتا ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر گھر پر موجود ہو تو آپ جیسی صاحبزادیاں
بھی بُلی بُنی رہتی ہیں۔“

”بُلی بھیگ جانے پر اچھی نہیں لگتی۔“ وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔
”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ پانی دلوں دیتیں...!“

”پانی! اوہ... کھانے کے بعد۔“
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تب تو آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ لڑکی نے مایوسی سے کہا۔
”اچھا مجھے بھوک ہے.... منگوائیے کھانا۔“

”ہاں! کل نیے کچھ تھی اور آج کچھ ہے۔ مٹنوں میں بنتی اور بگڑتی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔
”غاباً اس سلسلے میں کسی انگوٹھی یا چراغ سے مددی جاتی ہوگی۔“ حمید نے انہائی سنجیدگی سے کہا
”اوہ....!“ وہ چونک کر حیرت سے بولی۔ ”تو آپ جانتے ہیں۔“
”بیا...؟“
”یہی کہ میں ایک جن کے قبضے میں ہوں۔“
”جی ہاں۔ میں نے آپ کے متعلق الف لیلے میں یہی پڑھا تھا۔“ حمید چڑکر بولا۔ ”ویسے کیا
میں آپ کے والد صاحب کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“
”والد صاحب۔“ وہ زیر لب بڑا بڑا۔ ”آخر یہ کیا بلاتے ہے؟“
”مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ بلاگھر میں موجود نہیں ہے۔“ حمید نے اور پری ہونٹ بھیجن کر کہا۔
”آپ کچھ خفا معلوم ہوتے ہیں۔“

”مجھے جلدی ہے اگر آپ پانی دلوادیں تو پاچھا تھا ویسے میں پھر کبھی بھی حاضر ہو سکتا ہوں۔“
”میاں اتنی بڑی ہوں۔“ لڑکی تھنڈی سانس بھر کر بولی۔
”آپ غلط سمجھیں مجھے جلد واپس جانا ہے۔“
حمدید کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ پاگل ہے۔
”طاولات.... او طالوت۔“ لڑکی نے عجیب کو آواز دی۔
وہ پھر جھپٹ کر باہر نکلا۔
”کھانا لاو۔“

اس نے ایک میراٹھا کران کے درمیان میں رکھ دی اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر
واپس آیا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا ساخوان اٹھانے ہوئے تھا۔
جیسے ہی خوان میراٹھا کیا حمید کے دیوتا کوچ کرنے لگے۔ خوان میں ایک بڑا سانپ کنٹلی
مارے پھن اٹھانے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں روشنی میں چک رہی تھیں۔
حمدید نے بیٹھے ہی بیٹھے جست لگائی اور دوسرا لمحے میں وہ برآمدے کے بیٹھے تھا۔
”بیارے.... میری جان۔“ لڑکی بھیجن ہوئی بھی۔
اس نے حمید کو دیوچ لیا اور آہستہ کہنے لگی۔ ”یہ طالوت.... سور بردا کینہ ہے۔ تم ذرگئے؟“

”طاولات.... او طالوت۔“ لڑکی نے کسی کو آواز دی۔
”حمدید پر اختیار جھپک پڑا۔ سامنے والے دروازے سے ایک گرافٹیل جبھی جھپٹ کر باہر ہے۔“
جس نے زمانہ قدیم کے جھٹی غلاموں کا سالب اس پین رکھا تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
”کھانا بیٹیں لاو۔“ لڑکی نے اس سے کہا۔
”جبھی کے جانے کے بعد حمید اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔“
”طاولات بڑا فادر جانور ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب میں تالاب میں اگی تھی تو یہ کو
کی شکل میں کائیں کرتا ہوا میرے گرد منڈلانے لگا تھا۔“
”حمدید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں آپنسا ہے۔ اس دیرانے میں اس قسم کی عمارت
موجودی ہی کم حیرت انگیز نہ تھی۔

”ہاں تو آپ ہمالیہ سے کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔
”باندھ کر۔“ حمید بولا۔ ”اس وقت میرے پورے جسم پر ایک ایک فٹ لے بال تھے۔“
”بال! لیکن اب تو نہیں ہیں۔“
” وجہ یہ ہے کہ میں روز صحیح اور سے نیچے تک شیو کر ڈالتا ہوں۔ سر پر تھوڑے سے بہ
یاد گار چھوڑ دیئے ہیں۔“
”اوہ....!“
”تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”اور وہ صاحبہ کہاں اگی تھیں جو آپ سے پے
مجھے ملی تھیں۔“

”کون؟ کیا یہاں؟“ لڑکی کے لمحے میں حیرت تھی۔
”جی ہاں...!“
”لیکن یہاں تو میرے او طالوت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“
”تو پھر مجھے دھوکا ہوا ہو گا۔“ حمید نے لاپرواٹی سے کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے
کے بیان پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اسے شرارت ہی سمجھ رہا تھا پھر بھی اس مکان اور
کے مکنوں کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے بے چلن ہو گیا۔
”میرا خیال ہے کہ یہ عمارت زیادہ پرانی نہیں ہے۔“ حمید نے خیال انداز میں بولا۔

اور شہدیلی خوبیاں.... تمہیں شہدیلی پر اعتراض تو نہیں۔“

”نہیں! اعتراض کیوں ہوتا۔“

”میں سمجھا شاید تم اسے قواعد کے رو سے غلط قرار دے دو۔“

”محبت کرنے والے قواعد کی پرواہ نہیں کرتے۔“ لڑکی سمجھی گی سے بولی اور حمید سوچنے کا کر شاید اب اتنی ذہینت لڑکی سے کبھی ملاقات نہ ہو۔

”تو تم محبت کرنا چاہتی ہو۔“ حمید دردناک آواز میں کراہ۔ لیکن اس کی آواز دبی دبی تھی۔ اسے اس کا بھی تو خیال تھا کہ اگر بابا میاں قسم کے کوئی بزرگ گھر پر موجود ہی ہوئے تو کیا ہو گا۔“

”یقین جی تباہ تم کون ہو۔“ لڑکی اس کا ہاتھ دبا کر بولی۔

”اوہر چلو...!“ حمید نے مالتی کی طرف جہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں برآمدے سے اتر کر روش طریقہ کے لان پر آبیٹھے۔ لڑکی سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میری داستان بہت درد بھری ہے۔“ حمید ایک آہ جگہ خراش کھینچ کر بولا۔ ”آے غنچہ دہن دئے گل... انداز میں رہنے والا شہر بے نیل و مرام کا ہوں اور لوگ مجھے شہزادہ امر و بخت کہتے ہیں۔“

حمدید نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی ایک بے تحاش قسم کے قیفی کو نہایت صفائی سے دیا گئی۔ حمید بولتا رہا۔

”میرے باپ شہنشاہ شاخجم نصیب نے مجھے بیدا کرنے کے سلسلے میں ایک خانہ باغ ترستیب دیا اور حسب دستور بخوبیوں سے حکم گلاؤ دیا کہ بارہ برس تک عورتیں میری شکل نہ دیکھنے پائیں لیکن وائے پر حال شہنشاہ شاخجم نصیب کہ جب میں پانچ ہی سال کا تھا تو ایک عورت نے مجھے اس طرح دیکھ لیا پس اُس دن سے یہ حال ہے کہ میں صحر اصر اجتنگل جنگل مارا پھر تا ہوں۔ لہذا کبھی پڑوں ختم اور کبھی پانی ختم۔ اس غریب الوطنی میں ایک بیس کمپنی کے ایجنت کے چکر میں پڑ کر کار بھی فریضی پڑی۔“

حمدید آہ سرد بھر کر خاموش ہو گیا۔

”کیا نوچنے لگے۔“ لڑکی تھوڑی دیر بعد بولی۔

”نہیں....!“ حمید دانت بھیج کر بولا۔ ”شاید یہ پاگل خانہ ہے۔“

”دولت خانہ۔“ لڑکی نے سمجھی گی سے تھیج کی۔

جبشی خوان اٹھا کر پھر اندر چلا گیا۔ وہ شروع سے اب تک مشین کی طرح حرکت کرتا آیا تو اس دوران میں ایک بار بھی اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی جو میں چھنسنے والا ہے۔

”خفا ہو کر نہ جاؤ۔“ لڑکی نے اُسے برآمدے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

حمید کا عجیب حال تھا۔ غصہ بھی اور ندامت تیوں نے ایک ساتھ اس پر یلغار کر دی تھی لڑکی اُسے پھر برآمدے میں کھینچ لے گئی۔

”یہ طالوت.... واقعی بڑا مکینہ ہے میں معافی چاہتی ہوں۔“

حمدید حقیقتاً اس فکر میں تھا کہ کسی طرح نکل بھاگے۔

”تو آپ پانی...!“

”آج رات یہیں شہر جاؤ تو کیا حرج ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”کیوں؟“

”آج وہ جن نہیں آئے گا۔“

”محترمہ! یہ بیسویں صدی ہے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔ ”آج کل کے لئے شرات بیکار ہے۔“

”شرات اُمیں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

حمدید نے سوچا کہ اس طرح سر ما رنا فضول ہے۔ کیوں نہ وہ بھی انہیں خرافات پر اتر آئے لہذا وہ اپنے حرکات و سکنات میں ڈرامائی انداز پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ چاندنی کل بھی اتنی ہی جیسن تھی۔“ حمید کی آواز خوابیاں تھیں ”چاندنی...!“ لڑکی نے سکی سی لی۔

”ایسی ہی چاندنی تو تھی جب میں۔“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا؟“ لڑکی کی آنکھیں کچھ اور نشیلی ہو گئیں۔ حمید افق میں دیکھنے کی ایک نگہ کر رہا تھا۔

”وہاں.... اس پار.... جہاں بھار کے خوش گلوپرندے.... طربیہ گیت گاتے ہیں۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اس رو سیاہ جن کے پنج سے کس طرح چھڑاؤں۔“
”آہ میں اس نا بلکار خوک پیکر سے تجھ آگئی ہوں۔“

”ایک تدبیر ذہن میں آئی ہے۔“

”کیا؟“ لڑکی نے پُر اشتیاق لجھے میں پوچھا۔

”پچھے لگاؤ کہ اس نے اپنی زندگی کا بیمه کر لایا ہے یا نہیں۔“

”نہیں کر لایا۔ میں پوچھ پکلی ہوں۔“ لڑکی ایک سیساخہ قسم کی مسکراہٹ کو دبا کر بولی۔

”تب تو میں اُسے کسی پیدا بیجٹ کے چکر میں پھنسا کر تمہیں صاف نکال لے جاؤں گا۔“

”چج...!“ لڑکی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ایک بار میں نے بھی اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔“

”کیسے؟ کیا بات تھی۔“

”اب سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ حمید اپنے پانچ میں تمباکو بھرتا ہوا بولا۔ ”میں محضرا پھر تاپھر اتنا ایک شہر میں جانکلا۔... کہ نام جس کا نگار سلطانہ تھا۔ شہر پناہ کے چھانک پر بنے ایک جم غیر دیکھا۔ بہت سے ...“

”... ہے کو پکڑے اس کی ناز برداریوں میں مصروف تھے۔ جیسے ہی میں نے چھانک میں قدم رکھا گدھے نے دولتیاں جھاٹیں اور ان لوگوں سے چھوڑ کر تیر کی طرف میری طرف آیا اور میری ناٹاگوں میں سے اس طرح نکلا کہ میں دوسرے لئے۔“

”اس کی پیچھے پر سوار تھا۔ لوگوں نے تالیاں بجا تیں نعرے لگائے اور ٹوپیاں اچھالیں۔ پھر انہوں نے گدھے پر سے اُترنے نہ دیا اور مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جلوس کی شکل میں۔“

”مجھے گدھے پر سے اُترنے نہ دیا اور مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جلوس کی شکل میں۔“ بڑھے۔ میں نے ایک شخص سے کہ مرد عقیل و فہیم معلوم ہوتا تھا اس عزت افرانی کی وجہ پر تو اس نے کہا کہ ”جہاں پناہ بادشاہ بنا دیے گئے؟“

”بادشاہ۔“ لڑکی کے لجھے میں حیرت تھی۔

”ہاں! یہ اس ملک کی رسم تھی! جب بادشاہ مرجاتا تھا تو لوگ ایک گدھے کو پکڑ کر اسی بادشاہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ گدھا جسے اپنے اوپر سوار کر لیتا تو ہی بادشاہ بنا دیا جاتا۔ اتنی بات یقیناً بڑی اچھی تھی لیکن اس مرد عاقل نے ایک بات اور بھی بتائی جسے سن کر مجھے وجد کے میں گدھے سے اُتر جانا پڑا۔“

173
حمد خاموش ہو کر پانچ سلگانے لگا۔
”کیا بات تھی؟“ لڑکی بے چینی سے بولی۔
”اس نے بتایا کہ مرتب وقت یہ گدھا بادشاہ پر سوار ہو جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں اُترتا جب تک اُس کا دم نہ نکل جائے۔ بہر حال میں نے گدھے سے اُتر کر شور چماشا شروع کر دیا کہ گدھے کی آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ مجھ نے کہا کہ شاہی گدھے کی توہین نہیں بروداشت کی جا سکتی۔ تمہیں اس کی آنکھوں کی کمزوری کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔ بات بڑھ گئی آخر فیصلہ یہ ہوا کہ گدھے کو کسی ماہر امراض چشم کے پاس لے جایا جائے۔ قصہ منحصر یہ کہ گدھے کی آنکھیں شست کرائی گئیں اور واقعی وہ کمزور نہیں۔ گدھے کے لئے چشمہ خریدا گیا۔ چشمہ لکتے ہی کجھت نے پھر میری ہی طرف رخ کیا۔ میں نے پھر غل غپاڑہ چیلکا کہ یہ نئے میں معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے گدھے کو پکڑ لیا۔ کیونکہ انتخاب کی ساعت میں چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب کل ہو گا۔ لیکن گدھا تمہارے ہی ساتھ رہے گا۔ تو اے ناز نین پری تمثاں وہ گدھا میرے پیچھے لگ گیا۔ میری کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کس طرح چیچا چھڑاؤں۔ آخر ایک تدبیر سوچ گئی۔ میں نے کسی بیمه کمپنی کے اجنبیت کی تلاش شروع کر دی۔ تقدیر مہربان تھی کہ جلد ہی مل گیا۔ میں نے اس سے گدھے کا تعارف کرایا اور وہاں سے نودو گیا رہ ہو گیا۔ پھر کافی رات گئے اجنبیت کے مٹھا نے پر دوبارہ گیکا۔ گدھا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے وہ رات اجنبیت ہی کے یہاں برس کی اور رات بھر میں سے سونے کے لائچی میں میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں بھی اپنی زندگی کا بیمه کراؤں گا۔“
”وسرے دن صبح ہی صحیح میں اُسے اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے چھانک پر پہنچ گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی کافی بھیڑ تھی۔ گدھا چشمہ لگائے اداں کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو۔ جیسے ہی دونوں وہاں پہنچے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لکھ بیدہ کمپنی کے اجنبیت نے لکھا رکھا اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی گدھے کا رخ پھر گیا۔ اجنبیت اس کے پیچھے دوڑتا ہوا چیخ رہا تھا۔ سنتے تو سی مسٹر۔ خدارا مستقبل کے لئے کچھ تو سوچئے۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے بچے... آپ کے بوڑھے ماں باپ.... آپ کی عزیز از جان رفیقة حیات....“ پھر گدھے نے کسی طرح جان نہ پیختی دیکھ کر ایک کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ اس طرح میں بادشاہ بننے بننے پیچ گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ گدھا کثرت سے برائی کرنا پڑتا

آسمانی فائز

نہ جانے کب تک حمید پر وہ عجیب و غریب نیند طاری رہی۔
دوسرے دن.... اگر سوچ کی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر نہ پڑتیں تو وہ سوتا ہی رہتا۔
بہر حال نیند کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کیدی ہی میں سفر کر رہا تھا لیکن
چھپلی سیٹ پر لیٹیں لیتے وہ کھڑ برا کر انھے بیٹھا۔ ڈرائیور کرنے والے کی پشت اُس کی طرف تھی اور وہ
انپکھ فریدی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔
چھپلی رات کے سارے واقعات حمید کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے ایک بار پھر
آنکھیں مل کر چاروں طرف دیکھا اور اُسے یقین آگیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ سیاٹھ ہی
فریدی کی آواز بھی سنائی دی۔

”آرام فرمائیے! آرام فرمائیے آپ انھے کیوں بیٹھئے۔“

حمدی نے جست لگائی اور اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ کیدی شہر میں داخل ہو رہی تھی۔
”میں کہاں تھا؟“ حمید نے بے ساختہ پوچھا۔
فریدی نے اُسے گھور کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔
”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ حمید نے پھر کہا۔

فریدی اپنے ہونٹ پھینچنے خاموش رہا۔ حمید کی بوکھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
فریدی نے اُسے معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں پایا ہوں۔
”میں تمہارا تابولہ کراوینے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تابولہ تورات ہی کو ہو گیا ہوتا..... مگر.....!“
”میں کوئی سڑی بسی داستان یا اس حرکت کا جواز سننے کے لئے تیار نہیں۔“
”میں کہتا ہوں میری بات تو سننے۔“
”اس کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا تو یہی تباہ بیجے کہ میں آپ کو کہاں اور کس حال میں ملا تھا۔“
”حید! بکواس مت کرو۔“

”خدا۔ واللہ اعلم بالصواب۔“
لوگی بے تباہ نہ رہی تھی۔ حمید نے اتنی دیر میں بناوٹ کا سارا جال توڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی
دیر تک ہنسنی رہی پھر یا کیک سنجیدہ ہو گئی اور مصلحت آواز میں بولی۔
”پیارے امر و بخت مجھے کسی طرح نکال لے چلو۔ ہائے یہ چاندنی رات اور اُس کا لے کلوڑ
جن کا تصور بھی میرے لئے تکلیف دے ہے۔“
”اگر تمہیں یقین ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہہ نہیں کر لیا تو تمہیں اس قید سے رہا
دل وادوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اب مجھے جانا چاہئے... اور پانی۔“
”نہ جاؤ یا رے امر و بخت....!“ لوگی ٹھنک کر بولی۔
”اف فوہ! مجھے یہہ کہنی کا ایک ایجنت بھی تو تلاش کرنا ہے۔“
”اچھا کھانا تو کھا لو۔“

”بخشنے! اگر اس بارہ طالوت کا پچھے....!“
”اوہ! تم سمجھے نہیں تھے۔ دراصل کھانا تیار نہ رہا ہو گا۔ اسی لئے اس نے جھلا کر پہ حركت
کی ہو گی۔“
”خیر! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ واقعی آپ کمال کی آدمی ہیں۔ جب بھی اور ہر
گذر دن کا آپ سے ضرور ملوں گا۔ اب تو آپ سنجیدگی سے اپنا تعارف کرادیجئے۔“
لوگی حیرت بے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”میں سمجھی نہیں۔“

حمدی نے سوچا باب اسے کچھ اور سمجھانا بیکار ہے۔ پھر کہنی سمجھا جائے گا۔
”تھوڑی دیر بعد وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں میں وہی پہلے والی
تکنی گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ لیکن حمید سوچ رہا تھا کہ کھانے بہت لذیذ ہیں۔ خصوصاً شاہی نکوڑ
کھاتے وقت اسے سچھ نیند آئے گی۔ باہر چاندنی کی ننکت چادر چھپلی ہوئی تھی اور اس کی زبان،
خوب شہود ارشادی نکلے گل رہے تھے۔ آنکھوں کے پوٹوں میں گدگی ہو رہی تھی اور ریڑہ
ہڈی میں نسر و رانگیز لہریں تھیں اس کا داہنہا تھے تجھے نسیٹ اٹھاہی رہ گیا اور اُسے گھری نیند آگئی۔

”میا ہمیشہ کے لئے۔“ حمید نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔
”گٹ آؤٹ۔“

”میں کچھ نہیں کہتا۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اگر آپ کسی غلط فہمی میں بٹلا ہیں تو بتلارہے
لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ نے مجھے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔“

فریدی اُسے غور سے دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کے الفاظ کو تو لئے کی کوشش
کر رہا ہو۔

”کیوں؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے کہ جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”ہوں!“ فریدی اپنے ہونٹ بھینچ کر رہا گیا۔

”میں اگلی سیٹ پر تھا لیا پچھلی پر۔“

”پچھلی پر....!“

”اور کار کہاں تھی۔“

”سرڑک کے کنارے۔“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”سرڑک کے کنارے۔“ حمید نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے دہر لیا۔

”اب کوئی ایسی داستان دہرا دو جس پر مجھے یقین آجائے۔“

”اُف فوہ! یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ضرور یقین کروں گا۔ کیونکہ تمہارے ساتھ شمین کی دو خالی بو تلیں بھی تھیں۔“

”بو تلیں؟“ حمید آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”چلو بور مت کرو اونچ ہو جاؤ۔“

”عجیب مصیبت ہے۔“

”جاو بابا جاؤ... میری طرف سے جنم میں جاؤ۔ میں اب کسی بات کیلئے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں شاید جنم سے بھی اسی طرح نکال دیا جاؤ۔“ حمید اپنے جیب میں پڑے ہوئے پاسپ کو
ٹوٹا ہوا بولا۔

”تمہارے ساتھ کون تھا۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے یقین تھا کہ
فریدی اس کی داستان سن کر صرف قہقہے لگائے گا۔ یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پچھلے
رات کو اُسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ شاید تکڑے کھاتے وقت طاری ہونے والی غنوڈی اُسے یہ
تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر اُس کے بعد کیا ہوا؟ کیا فریدی اُسے اسی عمارت سے لا بایا ہے یا کہیں اور
سے؟ کوئی بھنگ کر فریدی حمید کی طرف دیکھے بغیر اترنا اور اندر چلا گیا۔ حمید چند منٹ بیٹھا کوئی
سوچتا رہا پھر کیدی گیر اج میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

فریدی اندر ونی برآمدے میں ٹھیل رہا تھا اور اس کا موڈ زیادہ خراب تھا۔ حمید چپ چاپ آکر

دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ فریدی نے ایک بار پھر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

حمدید کی لمحن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر فریدی نے اُسے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔

وہ بھی اس کے کمرے میں چلا گیا۔

”بہتر یہی ہے کہ تم اس وقت کہیں ٹھیل جاؤ۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”میرا موڈ بہت خراب ہے۔“

”آپ تو اس طرح تاؤ کھارہ ہیں جیسے میں آپ کی کنوٹی لڑکی ہوں۔“ حمید اوپر ز

ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”اور آپ نے مجھے کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔“

فریدی پھر اسے گھورنے لگا۔

”اگر آپ فوراً ہی سیدھے نہ ہو گئے تو شاید آپ کو پچھتا پڑے۔“ حمید نے کہا۔

”بک چلو۔“ فریدی سگار سلاگتا ہوا بولا۔ ”لیکن تمہاری ان حرکتوں کی بنا پر مجھے بڑا
ندامت ہوتی ہے۔“

”کن حرکتوں کی بنا پر؟“

”مجھے چڑھا رہے ہو؟“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میکسی دوسرے کا سراغ بھی پایا جاتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”آئینہ دیکھو...!“ فریدی نے ڈرینگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

حمد کو اپنے گالوں پر لپ اسٹک کے دھبے نظر آئے۔

”میں بچ کہتا ہوں کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“ حمید فریدی کی طرف مڑکر بولا۔

”خیر آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے وہ داستان دہرانی ہی پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔

اور پھر اس نے الف لیلی والی داستان شروع کر دی۔ فریدی لاپرواں سے سنتا رہا۔ نہ تو اسے

ہنسی آئی اور نہ اس نے کسی موقع پر حیرت ہی کا اظہار کیا جب حمید سب کچھ کہہ چکا تو فریدی کے

ہونٹوں پر ایک خفیہ سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

”یہ کہانی بیسویں صدی کے مغلیار سے مطابقت نہیں رکھتی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شاید تم:

”نہیں جانتے کہ وہ عمارت کس کی ہے؟“

”نہیں میں نہیں جانتا۔“

”اگر جانتے ہوتے تو اس سے کم از کم اس قسم کی کوئی داستان منسوب نہ کرتے۔“

”کیوں؟ وہ کس کی ہے۔“

”ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی کی۔“

”ڈاکٹر نارنگ کی؟“ حمید کی آنکھیں حیرت سے بچیل گئیں۔ ڈاکٹر نارنگ وہ پھر بڑی باری۔

اُسے حقیقاً حیرت تھی۔ ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اُس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور ترین

آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال یہ

محیر تھا کہ وہ اس ڈرائی سے کیا مطلب اخذ کرے جو بچپنی رات اس عمارت میں کھیلا گیا تھا۔ یہ

یہ بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ غیر شادی شدہ تھا۔ لہذا یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس کی لڑا

رہی ہو گی۔

”کیوں؟ کیا سوچنے لے؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اب اصل واقعہ پہنچان کر جاؤ۔“

”خدائی قسم میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں ایک فیضی بھی جھوٹ نہیں۔“

فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”خیر...!“ حمید آہستہ سے بڑی باری۔ ”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ہیلاؤ کی... وہ نہ جانے کون تھی اور کیا تھی۔ کتنی بجیب تھی.... چال کتنی حیرت انگیز تھی۔“
”حیرت انگیز نہیں بلکہ قیامت کھو۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔ ”تمہاری بدولت مجھے کافی
ثر مندگی ہوئی ہے۔ پولیس کی ایک ٹشٹی لاری لے کر تمہاری تلاش میں جانا پڑا اور تم جس حال
میں ملے اس کا تو اس یہی تقاضا تھا کہ میں ڈوب مرتا۔“

”پھر آپ نے وہی بات کہی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”آپ کیوں ڈوب مرتے کیا میں آپ کی
روجہ محترمہ ہوں۔“

فریدی کو پھر غصہ آگیا اور حمید موقع کی نزاکت کا احساس کر کے اُس کی پیٹھے تھکنے لگا۔
”خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ایک بار دیکھا ہے، اور دوسری بار
دیکھنے کی ہوں ہے میں اسی عمارت کے قریب ہی کہیں ایک جھوپڑی ڈالنے والا ہوں۔“

”چھوڑو ختم کرو۔“ فریدی اکتا کر امتحنا ہوا بولا۔ ”اب اگر تم نے کبھی بلا ضرورت شراب
استعمال کی تو میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔“

”اس وقت ایشیا کا عظیم ترین سراغ رساں بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔“ حمید نے ہونٹ
سکوڑ کر کہا اور فریدی پلٹ پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ بچھے کہتا حمید پھر بولا۔ ”اگر میں آپ کو دلاور نگر
کے قریب ہی کہیں ملا تھا تو یقیناً میں نے شمپین کی دبو توںیں صاف کر دی ہوں گی۔ غصب
خدا کا شمپین کی دبو توںیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ کیا میں دلاور نگر کے قریب ہی ملا تھا۔“

”نہیں۔“ فریدی نے نیزاری سے کہا۔

”پھر کتنا فاصلہ رہا ہو گا۔“

”فضل و وقت نہ بر باد کرو۔“ فریدی لاپرواں سے بولا حمید کے خیال دلانے پر وہ بھی اس
ملکے پر سمجھی گئی نے غور کرنے لگا تھا۔ حمید اسے دلاور نگر سے تقریباً پینتیس چالیس میل کے
فاصلے پر ملا تھا۔ شمپین کی دبو توںیں صاف کر دینے کے بعد اتنی دور کا سفر شاید فولاد کے آدمی سے
بھی نہ ہو سکتا اور یہ چیز بھی تقریباً ناممکن تھی کہ حمید نے اتنا سفر کر کچنے کے بعد رک کر دو
بو توںیں پی ڈالی ہوں۔ یہ بات فریدی بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حمید شراب کا عادی نہیں ہے۔
دوسری بات یہ کہ اگر کوئی عورت وہاں اس کے ساتھ آئی اور اسی کی ترغیب پر حمید نے یہ حرکت
کر ڈالی تو پھر وہ خود کہاں گئی۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنی دور پیدل تونہ گئی ہو گی۔

فریدی نے پھر حمید کی طرف دیکھا جو اس طرح ہونٹ سکوڑے بیٹھا تھا جیسے سیٹی بجانے، ارادہ کر رہا ہو۔

”آج تمہیں پاگل نانے میں داخل ہوتا ہے۔“ فریدی نے سمجھی گئی سے کہا۔

”میا...؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا اور فریدی کے ہونٹوں پر شرات آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”پاگل... خانے... میں۔“ فریدی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ساجد حقیقتاً پاگل نہیں ہے۔“

”کون ساجد؟“

”کرتل فرید والا کیس بھول گئے۔“

”کرتل فرید۔“ حمید اپنے ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔

”چھ ماہ قبل کی بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بجلہ تمہیں کیوں یاد ہو گی۔ کرتل فرید جو پراسرار طریقے پر قتل کر دیا گیا تھا اور جس کی بہن غائب ہو گئی تھی۔“

”نہ جانے کتنوں کی بہنیں روزانہ غائب ہوتی رہتی ہیں۔ میں کہاں تک خیال رکھوں۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”تب پھر تمہیں اس کیس کی تفصیل کہاں یاد ہو گی۔ معاملہ تقریباً دب ہی گیا تھا۔ لیکن کل رات کو...!“

دفتاریلی فون کی گھٹتی بجی۔ فریدی نے رسیور اٹھایا۔

”بیلو! فریدی بول رہا ہے.... ارے۔“

فریدی کے ہاتھ سے رسیور چھوٹ پڑا۔ اور اس نے مضطربانہ انداز میں اسے پھر اٹھایا۔ ”بیلو... بیلو... کہاں... کیسے؟... آتا ہوں۔“ وہ رسیور رکھ کر تیزی سے حید کے طرف مڑا۔

”چلو...؟“ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

حمدی اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

گیراں سے کار نکالنے والے اس کے ہاتھ کا نپ رہے تھے۔ حمید نے کہی اسے اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

”وزیر خزانہ۔“ فریدی تھوک نگل کر بولا۔ ”وزیر خزانہ بھرے جمع میں قتل کر دیے گئے۔“

”بھرے جمع میں۔“ حمید اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

کیڈیلاک سڑک پر فرائٹ بھرتی رہی اور وہ دونوں خاموش رہے۔ نہ تو حمید نے یہ پوچھا کہ یہ حادثہ کہاں ہوا اور نہ ہی فریدی نے بتایا۔ اس کی آنکھیں وڈا اسکرین پر جب ہی ہوئی تھیں اور ہاتھ اسٹرینگ پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور بقیہ جسم قطعی بے جان معلوم ہوتا تھا۔

حمید کار میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنے چہرے سے لپ اسک کے دھبے صاف کر رہا تھا۔

”اپنے بیہاں سے کس کس کی ڈیوٹی تھی۔“ حمید نے ٹھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کئی انپکٹر تھے، پر شنڈنٹ بھی تھے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ وزیر خزانہ کی مخالفت کہیں بھی نہیں تھی۔ نیک تام وزراء میں سے تھے۔“

”یہ حادثہ کہاں ہوا۔“

”یونیورسٹی میں... وہ شعبہ فلکیات کا افتتاح کر رہے تھے۔ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔“

”قاتل ضرور پکڑ لیا گیا ہو گا۔“ حمید بولا۔

”قاتل...!“ فریدی آہستہ سے بڑھ رہا۔ ”کسی نے شاید قاتل کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔“

”کیوں...؟“ حمید چوک کر بولا۔

”میں اس وقت تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجھے گی تھی۔“

”کیا؟“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو حمید اس کی خاموشی پر جھنجھلا جاتا۔ لیکن خود اس کا ذہن اس بڑی

طرح الچھ گیا تھا کہ اسے اپنے سوال کا دھیان تک نہ رہا۔

یونیورسٹی کی کپاؤٹ پولیس والوں سے بھری تھی۔ ہر طرف سرخ گیزیاں اور خاکی ٹوبیاں نظر

اڑی تھیں۔ خصوصاً جلسہ گاہ جو کئی بڑے بڑے شامیاں پر مشتمل تھی عجیب افراتفری کا عالم

تھا۔ فریدی اور حمید بھیڑ میں گھٹتے چلے گئے۔ ڈاکس کے گرد پولیس آفیسروں نے گھیرا اڈا دیا تھا۔

ڈاکس پر شہر کے اعلیٰ حکام اور کچھ معززین سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہیں میں فریدی کے بھائی آئی۔ جی اور ڈی۔ آئی۔ جی بھی تھے۔ ڈاکس کے دامنے سرے پر ایک مددگار پیشواد عائیں پڑھ رہا تھا۔ فریدی کو دیکھ کر ڈی آئی جی نے اسے ڈاکس پر آنے کا شارة کیا۔

گولی مقتول کی پیشانی پر لگی تھی۔ حمید نے لاش پر سے اپنی نظریں فوراً ہی ہٹالیں۔ بدجنت کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے اتنے اچھے آدمی کو موت کی آنکوش میں دھکل دیا تھا۔ میر میں ان کی علم و دستی اور خدا ترسی کی دھوم تھی۔ نہ جانے کتنے یتیم اور بیوائیں انہیں کے سہارہ زندگی ببر کر رہی تھیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر ڈی۔ آئی۔ جی اسے ڈاکس کے اتار لے گیا۔ حمید بھی ساتھ تھا۔

”میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”اف میرے خوب نہ جانے وہ کیا بلا تھی۔ میں یہیں موجود تھا۔۔۔ وہ تقریر کر رہے تھے۔“

”قاتل۔۔۔؟“ فریدی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”ہبھاں کا قاتل، کیسا قاتل، نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔ شکل تو را تقلیل جیسی نہیں تھی۔ آواز دیکھی ہی تھی۔“

فریدی نے خیال انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”فضا میں تیرتی ہوئی آئی تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہتا رہا۔ ”بس ایک لمحہ ڈاکس کے سات معلق رہتی اور آڑی سبل منشہ درسے لمحے میں نیچے تھے۔“

”اور وہ پھر اسی طرح واپس گئی جیسی آئی تھی؟“ فریدی نے کہا۔ ”ڈی۔ آئی۔ جی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔“ پھر میں نے تو دیکھا نہیں۔ لوگوں کا بیان ہے۔“ تیر کی طرح اور پڑھتی چلی گئی۔۔۔ اور پھر نظریوں سے غائب ہو گئی۔“

حمدید سوچ رہا تھا کہ کیا فریدی پہلے ہی سے واقع تھا۔ اس کا یہ جملہ کہ کسی نے شاید قاتل شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی پر دلالت کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

”آڑی سبل منشہ تقریر کر رہے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔ ”ہاں انہوں نے تقریر شروع ہی کی تھی۔“

”مایک سے کتنے فاصلے پر تھے۔“

”وہی جو فاصلہ عموماً کھا جاتا ہے۔“

”مایک کہاں گیا؟“ فریدی مضطربانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مایک..... بھی مایک سے کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے دلی سے کہا۔ ”پڑھنے میں اس افرافری میں کیا ہوا۔“

”میں مایک کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے کسی کے حواس درست نہیں۔ تمہیں کیا الزام دوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا اور پھر ڈاکس کی طرف چلا گیا۔

فریدی مجھساتھ نظریوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

”آخ رہا یا لک کیوں۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بھی ڈاکس کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ڈاکس پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

”اوہ.....“ اس کے منہ سے بے ساختہ لکھا اور وہ ڈاکس سے اتر کر سیدھا اس طرف پہنچا جہاں ملائکروfon کے لوازم اکٹھا تھے۔ وہ چند لمحے ان کا جائزہ لیتا رہا پھر حمید سے بولا۔

”تم میں ملکہ وہ... یہ ساری چیزوں کی روکی جائیں گی۔“

”وہ پھر ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس والیں آیا۔“

”میں نے وہ سارا اس سامان رکو ٹھیک کیا ہے؟“

”کون سا.....؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”مایکروfon کے لوازمات۔“

”بھی اس سے کیا ہو گا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنجھلا کر بولا۔

”کیا وہ مشین اتنی بڑی تھی کہ اس میں کم از کم ایک آدمی بیٹھ سکے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”نہیں اتنی بڑی نہیں تھی۔“

”تب پھر مشین اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتیں۔ میڑو کمپنی میں جہاں سے ماکیکروfon آیا ہے۔“

پہلی فرصت میں پھرہ لگانا چاہئے تاکہ کوئی چیز اور ہر سے ادھرنہ ہونے پائے۔“

"اور...! اے۔ آئی۔ جی اُسے غور سے دیکھنے لگ۔
"جلدی بیجھ۔" فریدی نے کہا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دوسراء حملہ

ایک گھنٹے کے اندر اندر پورا ملک سر ایمگی کا شکار ہو گیا تھا۔ اخبارات کے خیلے چھپ رہے تھے۔ شہر میں تو ایسا نہایت خاصیت ہے۔ آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔ کرو ہے تھے۔ راہ گیر بر گوشیوں میں گفتگو کرتے اور ہر سے اور ہر نکل جاتے اگر کسی کے ہونزہ مسکراہٹ بھی آئی تو وہ دوسرے ہی لمحے میں چوک کر اس طرح سمجھا ہو جاتا ہے اس سے یہ لاش کے سرہانے سرزد ہوئی ہو۔

وزیر خزانہ بہت اچھے آدمی تھے اور جب کوئی بہت اچھا آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو کاغذ ذرہ ذرہ سو گوار معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہوا میں لک آہیں بھرنے لگتی ہیں۔ عالم آدمیوں سے زیادہ وہ لوگ پریشان تھے جن کی ذمہ داری مقتول کی جلدی گھے سے گھے سلامت واپس جانے ہی پر ختم ہو سکتی تھی۔ ملکہ سراج رسانی کی عمارت کے بڑے کمرے میں سب اکٹھا تھا۔

آئی۔ جی کا چہرہ اترنا ہوا تھا اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے آفیسر ایک دوسرے سر گوشیاں کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر ان کے درمیان۔۔۔ گماگرم بخشی ہوئی تھیں اور فیصلہ ہوئے بغیر ختم بھی ہو گئی تھیں۔

اس آسمانی را تقلیل کا مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کی نشست میں اس کی تباہ پہنچا جاسکتا۔ اس کے متعلق تو اتنا بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ آئی کس سمت سے تھی اور کس سمت۔ دیکھنے والے صرف اتنا بتا سکتے تھے کہ وہ ایک لبے اور لمبائی کی مناسبت سے بہت ڈچڑھے صندوق کی شکل کی تھی۔ فائیر کی آواز ایسی ہی تھی جیسی کسی را تقلیل کی ہوتی ہے۔

انپکٹ آصف انپکٹ ماہر کی طرف جھکا ہوا آہستہ کہہ رہا تھا۔ "ش لاک" ہوڑ کے صاحب نہار دیں۔ خواجہ میرزو والوں کے پیچے پڑ گیا ہے۔ میرے شیر کی ہربات نرالی۔"

۔۔۔ بھلما نائک و فون سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"
انپکٹ ماہر کوئی جواب دینے کے بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ آئی۔ جی اپنی بھاری کر کھرتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یہ درست ہے کہ اس آسمانی حرబے کے سامنے بھی بے بن تھے لیکن سوال تو یہ ہے کہ کسی ایسے حرబے کا وجود ہی کیوں! آخر ہم سب کس لئے ہیں۔ مجھے اپنے ٹھکے پفر تھا۔"

کوئی کچھ نہ بولا۔ سب کو جیسے سانپ سو ٹگھ گیا ہو۔
"مجھے سب سے زیادہ خلکیت تم سے ہے۔" آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔
اور ان سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں کیونکہ آئی۔ جی اور ہر ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے میں انپکٹ فریدی دکھائی دیا۔ اس کے پیچے سرجت حمید تھا۔ دونوں کے چہروں سے تھکن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہ کر سکا۔" فریدی نے آہستہ سے کہا اور ایک خالی کر سی پر بیٹھ گیل حمید کے ریک کا کوئی آدمی میٹنگ میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ اٹھے پاؤں واپس چلا گیا۔
"ماں نائک و فون کا کیا حصہ تھا؟" آئی۔ جی نے پوچھا۔
"ایک خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن فی الحال کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ دیے میں اب بھی ہیں کہاں ہوں کہ اس حادثے کا کچھ نہ کچھ تعلق مانیک و فون سے ضرور ہے۔"

"کیوں؟"

"ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ مشینیں آدمی کی قوت ارادی کی پابند ہو جائیں۔ وہ مشین کی میکانیکی ہی سُم کے تحت چلتی ہوں گی۔"

فریدی ناموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے! کہتے جاؤ۔" آئی۔ جی بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ یقیناً واڑ لس ہی سے کٹرول کی جاتی ہو گی۔"

"اور اس میں میلی ویژن سُم کا بھی داخل معلوم ہوتا ہے۔" فریدی نے کہا۔

"ای لمحے میں مانیک پر زور دے رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

دے دیا اور وہ آدمی دوسراما نیکرو فون لے آیا۔“

”اوہ....!“

”لیکن جلسہ گاہ میں بعد کو جو ما نیکرو فون ملے۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔“

”خاص بات؟“

”یعنی ان کا سکیفر م وہی تھا جو عام طور پر ہوتا ہے۔“

”اس دوسرے آدمی کا پتہ چلا۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں! اس میٹرو کے نیجہ کا بیان ہے کہ دوسرا کوئی ما نیکرو فون جلسہ گاہ میں گیا ہی نہیں اور نہ اس صورت و شکل کا کوئی آدمی اس تک پہنچا تھا۔ دوسراما نیکرو فون جو جلسہ گاہ میں ملا تھا اس کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ میٹرو سکپنی کا نہیں تھا۔ ویسے اس پر میٹرو سکپنی ہی کا نام درج تھا۔ میٹرو لاڈا پیکر سروس۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”حقیقتاً تم ملکے کی ناک ہو۔“

فریدی کے ساتھیوں کے منہ چڑھ گئے لیکن ذی۔ آئی۔ جی بے اختیار مسکرا پڑا تھا۔ یہ مسکراہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی تعریف کسی دوسرے سے سن کر کھل اٹھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر آئی۔ جی نے کہا۔

”تواب کیا کرنا چاہئے۔“

”ڈی۔ آئی۔ جی صاحب میرے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہیں۔“ فریدی تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

اس پر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف جگ کر آہستہ سے کچھ کہا اور آئی۔ جی پر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔

کچھ دیر پورے کرے میں سر گوشیاں ہوتیں رہیں پھر آئی۔ جی کی آواز سنائی دی۔

”بہر حال آپ لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے۔ یہ کیس خاص طور سے کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کو کوشش کرنی ہے۔“

اس مختصر سی ہدایت کے بعد مینگ، برخاست ہو گئی۔ سب چلے گئے لیکن فریدی وہیں

”اگر ہم یہ نہیں تشیم کرتے تو پھر ہمیں یہ مانا پڑے گا کہ وہ کسی آدمی کی قوت ارادی یعنی پابند ہے۔ اسے چلانے والے نے سوچ لیا کہ آزیبل مشر کو ختم کرتا ہے۔ لہذا وہ مشین ان تلاش میں چل پڑی۔“

آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔ شاید اسے فریدی کا الجہ ناگوار گزرا تھا۔

”شاید آپ کو وہ اڑن کم یاد نہیں۔“ انپکٹ آصف فریدی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”جو بھی جگ ٹھیم میں جرمونوں نے استعمال کئے تھے۔“

”اڑن کم...!“ آئی۔ جی آصف کو گھومنے لگا۔ ”ان کا یہاں کیا سوال؟“

”اڑن بول کا ستم دوسرا تھا۔“ فریدی نے آصف کو مخاطب کیا۔ ”ان کی اڑان اور اس میں سمت اور فاصلے کے تعین کو دخل تھا۔ اس لئے وہ بعض اوقات غلط جگہوں پر بھی گر پڑیں۔ فرض بھیج وہ برلن سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے تو وہ ادھر اور ہر جگہ ہوئے لندن پر پہنچیں گے۔ انہیں کنٹرول کرنے والی مشین انہیں لندن کی سمت برلن اور لندن کے درمیں فاصلہ کا تعین کر کے روانہ کرے گی۔ بس اتنے ہی فاصلے پر پہنچ کر وہ گرجاہیں گے جا ہے وہ تو ہو چاہے کوئی اور جگہ۔ سمت کے تعین۔“ زراسی بھی غلطی انہیں لندن کے بجائے کہیں اور کہتی ہے۔“

”نیز متعلق بحث سے کیا فائدہ۔“ آئی۔ جی نے اسے ٹوکا۔

”ہاں تو جناب والا میں یہ عرض کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آزیبل مشر کے گرن افراطی کے دوران میں ما نیکرو فون بدل دیا گیا۔“

آئی۔ جی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ”وہ شخص جو میٹرو سکپنی کی طرف سے ما نیکرو فون پر مامور تھا، حرast میں ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل ما نیکرو خراب ہو گیا تھا۔ اس نے اسے بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اتنے میں ایک آدمی یہ تجویز پیش کی کہ سکپنی سے دوسرے انگوالیا جائے جو نکل ما نیکرو فون کی دیکھ بھال کرنے والے اس لئے اس نے خود جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر اس نامعلوم آدمی نے کہا کہ اگر وہ ما نیکرو طلبی کے لئے تحریر دے تو وہ منتوں میں لاسکتا ہے۔ محافظ نے نیجہ کے نام ایک پڑھا۔

”کرنل فرید! ایک ریناڑڈ فوجی تھا۔“ فریدی بولا۔ ”دولت مند مگر شریف قسم کے لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل کسی نے اسے اس کی کوئی بھی ہی میں قتل کر دیا۔ اس کی بین قتل والی رات ہی سے غائب ہے اس کا پرائیویٹ سکریٹری اس حادثے کے بعد پاگل ہو گیا تھا۔ آج بھی پاگل خانے میں ہے۔ بہن کرنل ہی کے ساتھ رہتی تھی۔“

”وہی عرض کرنے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایک ہفتہ قبل کی بات ہے کہ ایک ایسے افرادی سے ملاقات ہوئی جو کرٹل کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا۔ دوران گنگوہ میں اس سے پہلے کہ کرٹل ایک اچھا میکین اور انجینئر بھی تھا۔ وائرلیس اور ٹیلی ویژن اس کے محبوب ترین موضوعات تھے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے اس فکر میں تھا کہ انہیں کی بنیادوں پر کوئی حرబہ تیار رہے اس وقت میں نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن جب پچھلی رات پرواز کرتی ہوئی وہ شے مجھے نظر آئی تو قدرتی طور پر اس شخص کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔“

”کیس کا انچارج کون تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔
 ”غالباً اپنے سدھیر۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں اس زمانے میں گار ساں والے معاملے میں لجھا ہوا تھا۔ بہر حال کرتل کے قتل کی نہ تو آج تک وجہ معلوم ہو سکی اور نہ قاتل ہی کا سراغ ملا۔ دراں کی بین کی حیرت انگیز روپوشنی ابھی تک پرده راز میں ہے۔ سدھیر کا خیال ہے کہ شاید وہ ابھی قتل میں شریک تھی۔ لیکن میں واقعات کی روشنی میں ایسا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ کرتل کا میرکھڑی پولیس کو عجیب حالت میں ملا تھا۔ کرتل کی بین کے بستر پر خون کے چھوٹے چھوٹے ہے تھے اور وہ اس طرح بے ترتیب تھا کہ جیسے اس پر بونے والے کو کسی سے جدوجہد کرنی پڑی ہو۔“
 ”نوکر کمال تھے۔“ آئی۔ جی نے لو جھل۔

”شگرد پیشہ میں جو کوٹھی سے کافی فاصلے پر ہے اور انہیں صبح ہی اس حداثے کی اطلاع ہوئی تھی۔“
 ”پکھ اسکا بھی اندازہ ہے کہ ان تمام معاملات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔
 ”فی الحال پکھ نہیں کہا جاسکتا۔“

کافی دیر تک ان تینوں میں بھیشیں ہوتیں رہیں۔ لیکن آخر میں نتیجہ وہی صفر، نہ کوئی فیصلہ
اوکا اور نہ طریق کارہی کا تعین کیا جاسکا۔

”خوفاک ہنگامہ“ جلد نمبر 8 لاحظ فرمائیے۔

موجود رہا۔
”اب بتاؤ۔“ ذی۔ آئی۔ جی فریدی کی طرف مخاطب ہوا۔ آئی۔ جی کی نظریں
چہرے پر بھی ہوئی تھیں۔
”میں نے پہلی رات اس را کھل کوپرواز کرتے دیکھا تھا۔“ فریدی نے کہا۔
”میا....؟“ دونوں بیک وقت بولے۔
”اور میرا خیال اُسی طرف گیا تھا۔“
”تو لیا تم پہلے ہی سے اس کے متعلق جانتے تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔
”تھوڑا بہت۔“
”پھر بھی تم نے کچھ نہ کیا؟“
”کل رات سے قبل مجھے اُس کے وجود پر یقین نہیں تھا۔“ فریدی نے کہا۔
بھی مجھے یقین واٹن نہیں تھا۔ اس کا تو اس وقت خیال آیا جب میں نے خادشے کی خبر
”تے... کے... کے...“

”تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟“
”شہر کے اتری حصے میں وہ زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔“
”کہاں گئی تھی؟“
”مشرق کی سمت!“ فریدی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اس کا امتحان کر رہے تھے۔“
”تو کیا تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو۔“
”بھی نہیں۔“

”بہر حال تم نے اپنی معلومات کو چھپا کر اچھا نہیں کیا۔“ آئی۔ جی کا لیجہ ناخو شگوار تھا۔
 ”جناب والا... معلومات کی نوعیت ہی اسی نہیں تھی کہ جس پر فوری ایکشن کیا جائے۔“
 ”لیعنی...!“
 فریدی نے ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کو کرتل فرید کا کیس تو یاد ہو گا۔“
 ”کرتل فرید۔“ ڈی۔ آئی۔ جی ذہن پر زور دیتا ہوا بولा۔ ”وہ جس کی بہن...!“
 ”جی ہاں! وہی...!“
 ”کیا کیس تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

فریدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ حمید کے گولی نہیں گئی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے گلروں نے اس کا چہرہ زخمی کر دیا تھا اور خود فریدی کی پیشانی کا زخم بھی انہیں گلروں کے لگنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے ردمال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور راگھیر سے بولا۔

”ٹھیک ہے! اب ٹھیک ہے۔“

”کسی نے اس پہلی کار سے گولی چلانی تھی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ کیا تفت آگئی ہے اس شہر میں۔“

”گولی! نہیں کسی شریر پہنچنے پر تھر پھینکا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”ہمال کرتے ہیں آپ ارے جتاب میں نے خود دیکھا تھا۔“

”آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

راگھیر حرمت سے ایک دوسرے کامنہ دیکھتے رہ گئے۔

کیڈیلاک سول ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔

حمدیت ہوڑی دیر بعد کسمبلیا اور کراہ کر سیدھا ہو گیا۔ سامنے لگے ہوئے آئینے پر نظر پڑتے ہی ایک ہلکی سی جیچ نکل گئی۔ اس کا سارا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”چھوٹا مت۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”لگھرا تو نہیں زخم گھرے نہیں ہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ کر جیس معلوم ہوتی ہیں۔“

”اوہ آپ بھی تو۔“

”میری گلر مت کرو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”بس تقدیر ہی تھی۔۔۔ ورنہ۔۔۔ گولی میرے دلہنے شانے کو چھوٹی ہوئی نکل گئی ہے۔ اگر کوٹ میں شولڈر پیڈنہ ہوتا، تو ہڈی صاف تھی۔ البتہ پچھلی سیٹ بر باد ہونے کا افسوس ہے۔“

حید نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ میں بڑا سو رخ تھا۔

”تو کیا وہی را لفٹ لیتھی تھی۔“ حید بوکھلا کر بولا۔

”نہیں گولی ایک کار سے چلانی گئی تھی۔“

”کار سے۔“

”ہاں اور وہ محض تمہاری وجہ سے نکل گئی۔ میں سمجھا شاید تم اللہ کو پیدا ہو گے۔“

فریدی کے دوسرے ساتھی مائیکروfon کے محافظ کے بتائے ہوئے علیے سے چھٹے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ریٹائرمنٹ روم میں چھوڑ کر مسکراتا ہوا باہر آگیا۔

شہر کی حالت اب تک ویسی ہی تھی۔ ویرانی اور سوگواری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فریدی کی کیڈیلاک تیزی سے سڑک پر پھنس لیا۔ حمید اور وہ خاموش تھے غالباً وہ دونوں اس سے بھی بے خبر تھے کہ ایک دوسری کار کیڈیلاک کا تعاقب کر رہی ہے۔

”فی الحال ساجد ہی والی کڑی اپنے ہاتھ میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون ساجد۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہی کرٹل فریدی کا سیکریٹری جو پاگل خانے میں ہے۔ اس سے کرٹل کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بنے ہوئے پاگلوں کو راہ راست پر لانا بڑا دشوار کام ہے اور کرٹل کی بہن، نہ سراغ! نہ تو اُس کا کوئی فونو ہی دستیاب ہو سکا اور نہ مکمل حلیہ! حلیے کے متعلق اختلاف بیانیاں پڑ جاتی ہیں۔ البتہ ایک چیز سب کے بیانات میں مشترک ہے اور وہ ہے اس لڑکی کی چال۔ سب کو کہتے ہیں کہ چلتے وقت وہ زمین سے کچھ اوپر تیرتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیا؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا۔ لیکن اس کی حرمت ایک سیکنڈ بھی قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوا ہیے اس کے کان کے قریب ہی ایک فائز ہوا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کی جیخ سنائی دی اور حمید کے چہرے پر لا تعداد چھپریاں سی آکر لگیں کیڈیلاک ایک جھٹکے کے سامنے رک گئی۔

”یہ حادثہ ایک سنسان سڑک پر ہوا تھا۔ دو ایک لوگ جو ادھر سے گزر رہے تھے فریدی کے کار کی طرف جھپٹے۔ فریدی اپنی پیشانی دبائے حمید پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا سر سیٹ کی پشت سے مٹ کر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ حمید کے چہرے پر کئی جگہ خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش ہوا تھا۔ فریدی نے اسے سنبھالنے کے لئے اپنی پیشانی سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے چہرے پر بھی خون کی چادر پھیل گئی۔“

”ٹھہریے۔ ٹھہریے۔“ ایک راگھیر اس کی مدد کے لئے لپکا۔ چار پانچ آدمی کار کے گرد ہو گئے تھے۔

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔

”کاش گولی میرے ہی گلی ہوتی۔“ حید خندی سانس بھر کر بولا۔ ”اب میرے چہرے پر
شمارنگ کے داغ ہوں گے اور کوئی لڑکی میری طرف دیکھنا بھی گوارانہ کرے گی۔“

”لڑکی....!“ فریدی نے منہ بنا کر کہا اور پانچلا ہونٹ دانتوں میں دپالیا۔
”ہائے۔“ حید آہستہ سے کراہا۔

”میں نے ماںکروں کے مقابلے میں ہلچاکر غلطی کی تھی۔“ فریدی بولا۔

پُر اسرارِ مسٹر کیو

اُس حیرت انگیز رائل کے متعلق نہ صرف شہر یا ملک بلکہ ساری دنیا میں چہ میگویا
ہو رہی تھیں۔ خصوصاً شہر کے لوگ تو بُری طرح ہیئے ہوئے تھے۔ ملک کی سر بر آور دہستیار
خوف اور اندریشوں کا شکار ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن کے اخبار نے وزیر خزانہ کے قتل کے ساتھ ہی محکمہ سراغِ رسانی کے

بہترین افراد پر حملہ کی بھی خبر چھپائی تھی۔ اخبار پیچے والے گلی کوچوں میں چیختے پھر رہے تھے۔

”محکمہ سراغِ رسانی کے دو آفیسروں پر بھی قاتلانہ حملہ، دونوں آفیسر اپنے زخموں
ڈرینگ کرنے کے بعد حیرت انگیز طریقے پر غائب ہو گئے۔“

یہ فریدی اور حید کے زخمی اور غائب ہونے کی خبر تھی۔ انہوں نے سول ہفتالیں میں اپنے

زخموں کی ڈرینگ کر لی تھی اور پھر اپنے ملکے کے اعلیٰ آفیسروں کو اطلاع دیئے بغیر روپوش ہو گئے
تھے۔ اخبارات کی اطلاع تو دراصل یہی تھی لیکن عام آدمی اسے کیا سمجھتے کہ اسی دن محکمہ سراغِ

رسانی کے ڈی۔ آئی۔ جی کی کار دلاور نگر کی طرف کیوں جا رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کے ساتھ پرمنڈٹ اور دو انسپکٹر بھی تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی خود کار ڈرایور
کر رہا تھا۔ پہنچیں میں پنچھے سڑک پر چلنے کے بعد کار ایک کپے راستے پر مڑ گئی۔ پھر وہ اُس عمارت
میں داخل ہوئی دکھائی دی جس میں سرجنت حید نے ایک حیرت انگیز رات گزاری تھی۔

ڈاکٹر نارنگ اسم۔ پی عمارت میں موجود تھا۔ اُسے ملکہ سراغِ رسانی کے آفیسروں کو
کوٹھی میں دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ مقتولِ نشر کے گھرے دستوں میں سے تھا۔

ڈاکٹر نارنگ دوسرے بدن کا ایک لمبا ترٹھا آدمی تھا۔ عمر بچا اور سماں کے درمیان میں رہی
ہو گی۔ لیکن صحت مند ہونے کی بنا پر یہ کہنا و شوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا
ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اور دورانِ نگتوں میں اپنی نظریں مخاطب کے چہرے
سے ہٹائے رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اُسے کبھی کبھی سے کرخت آواز آواز میں گفتگو کرتے
ہوئے نہیں سنائیا۔

”میں ان تمام لوگوں سے مل رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”جن سے مقتولِ نشر
کے قریبی تعلقات تھے۔“

”میں بھی انہی بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز کلکپاگی۔
پھر ڈی۔ آئی۔ جی کافی دیر تک مقتول کے دوسرا دستوں کے متعلق پوچھ چکھ کر تارہا۔
اور جب واپسی کیلئے بالکل تیار تھا تو اس نے اچانک ڈاکٹر نارنگ سے کہا۔ ”مجھے ایک شکایت بھی ہے۔“
”کہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرف نظر جاتے ہوئے کہا۔
”یہاں پر سوں رات کو میرے محلے کے ایک آدمی کے ساتھ بڑا خطرناک مذاق کیا گیا۔“

”یہاں...!“ ڈاکٹر نارنگ چونک پڑا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“

”کسی صاحبزادی نے اُسے کوئی نشہ اور چیز کھلا دی تھی۔“

”صاحبزادی نے۔“ ڈاکٹر نارنگ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، وہ راستہ بھلک کر اونھر نکل آیا تھا۔“

”اُسے غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ یہ حدادش کہیں اور پیش آیا ہو گا۔“

”اُسے یقین ہے؟“

”تب اس نے خواب ہی دیکھا ہو گا۔“ ڈاکٹر نارنگ مسکرا کر بولا۔ ”یہاں ہمیشہ اس عمارت کا
منظوم چند نوکروں کے ساتھ رہتا ہے اور وہ بھی میری ہی طرح تجد کی زندگی بس رکھ رہا ہے۔ میں
زیادہ تر شہر میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی اونھر بھی آنکھ تھوں۔ پر سوں میں یہاں نہیں تھا۔ یہاں کسی
لڑکی کی موجودگی سرے ہی سے مسحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس طرف اس ساخت کی کوئی اور عمارت نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا
”نہیں۔“

”اس نے بالکل بھی نقشہ بتایا تھا۔ جو میں اس عمارت کا دیکھ رہا ہوں۔“ ذی۔ آئی۔ جی بو۔
”مجھے حیرت ہے۔“

”اس نے ایک جبشی غلام کا بھی تذکرہ کیا تھا۔“

”جبشی غلام۔“ ذاکٹر نارنگ بے ساختہ پس پڑا۔ ”تب تو اس نے حقیقتاً خواب دیکھا ہو گا۔“

”وہ لڑکیاں تھیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی۔ اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”ان میں سے ایک:
ایسی تھی جسے ہم عرصہ سے تلاش کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ یک بیک سنجیدہ ہو گیا اور پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ چند لمحے بعد ایک قدر
صورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس نے سر کا سوت پین رکھا تھا اور گردن میں شوخر رنگوں والی
تائی تھی۔

”پرسوں رات کو یہاں کون تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ نے اس سے پوچھا۔

”جج..... جی..... کوئی بھی تو نہیں..... کوئی نہیں۔“ منتظم ہکلانے لگا۔

”بھروسہ مت بولو۔“

”تی کوئی نہیں..... میں سک سچ!“

”ہکلا کیوں رہے ہو... کوئی ضرور تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز بلند ہو گئی اور سیکریٹری کا ہنپتے لگا۔

”جج..... جی..... مم..... معافی چاہتا ہوں۔“

”کون تھا.....؟“

”ڈاکٹر کٹر ناگر.....!“

”یہ کیا بلا ہے۔“

”فلم ڈاکٹر، میرا دوست ہے۔ ادھر شونک کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے آپ کی اجازت
کے بغیر ٹھہرایا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی جبشی بھی تھا ان کے ساتھ۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اوہر دلڑکیاں بھی۔“

”جی نہیں صرف ایک تھی کنوں۔“

”کسی مسافر کو یہ تو فہ بیلایا گیا تھا؟“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔

”جی ہاں.... وہ کنوں کی شرارت تھی..... میں منع کرتا رہا۔.... مگر؟“

”اُسے کوئی نشہ اور چیز دی لگی تھی۔“ نارنگ نے پوچھا۔

”نشہ آور.... اورہ.... شاید وہ اسی لئے سو گیا تھا۔“

”صاف صاف بتاؤ۔“

”اُسے یہ تو فہ بانے کا پروگرام کنوں ہی نے بنایا تھا۔“ منتظم نے کہا اور شروع سے آخر
نہیں پوری داستان دہرانے کے بعد بولا۔ ”کنوں اور جبشی کے علاوہ کوئی اور اُس کے سامنے نہیں
گیا۔ پھر کنوں نے اُسے کھانا کھلایا اور کھاتے ہی کھاتے وہ سو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی نشہ اور
چیز تھی۔ پھر ہم اُسے اسی کی کار میں ڈال کر سڑک پر چھوڑ آئے تھے۔“

”تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کتنا برا جرم کیا ہے؟“ نارنگ بولا۔ ”اگر وہ سانپ اُسے کاٹ لیتا تو۔“

”جی.... دراصل اُس میں زبر نہیں تھا۔ ناگر اُسے کسی میں کی شونک کے لئے لایا تھا۔“

”لیکن کسی کو کوئی نشہ اور چیز کھلادینا بھی جرم ہے۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم گزر گزایا۔

”دلڑکیاں دو تھیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں ایک تھی۔“

”تمہاری بدولت مجھے ذلت نصیب ہوئی۔“ ڈاکٹر نارنگ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وہ
ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف مژہ کر بولا۔ ”آپ اسے لے جائیے اور جو کار وائی مناسب سمجھئے بیجئے۔ مجھے
کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم پھر گزر گزائے لگا۔

”دوسری لڑکی کون تھی۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے گرج کر پوچھا۔

”جج..... جی..... دوسری لڑکی مم..... ناگر کی محبوہ تھی۔“

”تم نے اب تک اُسے چھپایا کیوں تھا۔“

”وہ..... نن..... ناگر.....!“

”گھبراو نہیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی نرم لمحے میں بولا۔ ”میں نارنگ جی کی بدنامی کے خیال سے

تمہیں در میان میں نہ لاوں گا۔“

منظم تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔ “پہلے وہی لڑکی باہر آئی تھی پھر اس نے اندر جا کر اس مسافر کا تذکرہ کیا۔ تاگر اندر تھا اس نے جھاٹک کر باہر دیکھا اور کنوں سے تھوڑی دیر تک سر گوشیاں کرتا رہا۔ پھر اس نے کنوں کو باہر بچھ کر اس لڑکی کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ مسافر دراصل ایک ایسا ریس ہے جو اس کی محبوبہ پر ڈورے ڈالنے کی فکر کر رہا ہے.... وہ اُسے اچھی طرح یو تو قوف بنا کر رخصت کرے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی کا تذکرہ کسی سے نہ کروں کیونکہ وہ اسے بعض پر ڈیوسرول سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”تمہیں اس لڑکی سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔“

”جی نہیں وہ بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اس کی آنکھوں.....!“

”ہاں ہاں کہو! گھبراؤ نہیں۔“

”اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیداری میں بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔“

”تم ناگر کو کب سے جانتے ہو۔“

”پچھلے ماہ اس سے شہر میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”یہاں پہلی بار آیا تھا۔“

”نہیں دوسرا بار۔ اس سے پہلے بھی اس نے یہاں دو تین دن تک قیام کیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اکیلا ہی تھا۔“

”اس کا پتہ۔“

”سولہ پرنس اسکواز..... دولت گنج۔“

”سپرنشنڈنٹ نے پہنچ کیا اور ذہی۔ آئی۔ جی نے ہاتھ کے اشارے سے گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا۔“

”جاو۔۔۔!“ ڈاکٹر نارنگ سیکریٹری کو گھورتا رہا۔ پھر ذہی۔ آئی۔ جی بولا۔ ”مجھے اس واقعے پر افسوس ہے۔“

”اب بہتر بھی ہے کہ تم اپنابسٹر گول کرو۔“

”حضور میں بتاہ ہو جاؤں گا۔“ ”منظم گزر گزایا۔“

”تمہیں بیس منٹ کے اندر اندر کو ٹھی چھوڑ دینی ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے خنک لبھ میں کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

منظم اس کے عادت و اطوار سے اچھی طرح واقف تھا اور اس لبھ کو خوب سمجھتا تھا۔ چاروں ہزار اس نے اپنی ضروری چیزوں ایک سوٹ کیس میں بھریں اور باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر نارنگ مالتی کی جماڑیوں کے قریب آم کے درخت کے نمائے میں کھڑا تھا۔ اس نے منظم کو جاتے دیکھا اور منہ پھر لیا۔

سوٹ کیس وزنی تھا۔ کبھی وہ اُسے ہاتھ میں لٹکاتا اور کبھی کاندھے پر رکھ لیتا۔ ہاتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ کب تک اور کہاں تک اس طرح جائے گا۔

کچھ راستے کے دوسرے موڑ تک پہنچنے پہنچنے اس کے دونوں ہاتھ شانوں سے علیحدہ ہوتے معلوم ہونے لگے۔ ہر حال کسی نہ کسی طرح وہ پہنچنے سڑک تک پہنچ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کھڑا جائے۔

و�탏ست مخالف سے ایک کار آتی دکھائی دی۔ چونکہ وہاں سکرین سورج کے سامنے نہیں تھا اس لئے کار ڈرائیور کرنے والے کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے پھرے پر سرست کی لہر دوڑ گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ ”تاگر....!“

کار اس کے قریب آکر رک گئی۔

”نیلو راجن.... کہاں؟“ کار ڈرائیور کرنے والے نے کہا۔

”ارے یار کیا بتاؤ۔۔۔ شاید اس وقت پیدل ہی شہر جانا پڑتا۔“

”بھلا کیوں؟ چلو سوٹ کیس اندر رکھ دو۔“

راجن نے پچھلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر سوٹ کیس رکھ دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ پچھلی سیٹ پر ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس نے مسکرا کر سوٹ کیس رکھوانے میں مدد دی۔ راجن کے لئے صورت نئی تھی۔

”اوھر آجائو۔“ تاگر نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

راجن بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

”پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ راجن ہانپتا ہوا بولا۔ ”تمہاری ہی وجہ سے مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں تمہیں منع کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ آدمی دراصل محکم سر اور سانی کا کوئی آفسر تھا۔ یاد رکھ بتاؤ وہ لڑکی کون تھی۔“

ناگر ہنسنے لگا۔ ”پرواہ مت کرو پیارے۔ میرا بہت بڑا... کاروبار ہے۔“

”مگر... میں نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ البتہ تمہارا پتہ بتاتے وقت مجھے ہوش آگئا تھا... اور میں نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔“

”کسی بات کی فکر مت کرو۔“ ناگر بدن جھٹک کر بولا۔

”یاد رکھ بتاؤ، وہ لڑکی کون ہے۔“

”میری محبوبہ! میں اُسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کہیں سے بھگا کر لائے ہو۔“

”ہاں...!“ ناگر نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

کار ایک کچھ راستے پر مڑ گئی۔

”اوھر کہاں؟“ راجن نے پوچھا۔

”جلد پہنچیں گے کم از کم دس میل کا فرق پڑ جائے گا۔“

راستہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دونوں طرف سرکندوں کی اوچی اوچی اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔

”اور کیا پوچھا تھا پولیس والوں نے۔“

”اور تو کچھ بھی نہیں لیکن جرت ہے کہ انہوں نے مجھے اس خیال سے گرفتار نہیں کیا کہ اس میں ڈاکٹر نارنگ کی بدناہی تھی اور ڈاکٹر نارنگ نے مجھے اس طرح نکال دیا۔“

”فی الحال تم شہر میں کہاں جاتے۔“ ناگر نے پوچھا۔ کیا کوئی تمہارا دوست یا عزیز وہاں ہے۔“

”کوئی نہیں! میں تمہارے ہی پاس جاتا اور پھر کوئی اور انتظام کرتا۔“

ناگر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر راجن بولا۔

”یار وہ کتوں بڑی تیر لڑکی ہے۔“

”کیوں... کہیں عاشق تو نہیں ہو گئے اس پر۔“ ناگر نے بحمد اللہ اساقہ پر لگایا۔

”پچھے نہیں کیوں وہ میرے ذہن پر نہی طرح چاہی ہے۔“

”تو پھر عشق اور کسے کہتے ہیں۔“

”عشق بہت اوچی چیز ہے۔“ راجن سمجھ دی گئی سے بولا۔

دفتار راجن کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردان کپٹلی۔ راجن نے ترپ کر پلٹنا چاہا لیکن دوسرا سے لمجھے میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ پڑا... اور کارکر کی۔ ہاڑ کے اندر شدید قسم کی جدو جہد ہو رہی تھی۔ ناگر نے دوسرا گھونسہ مارا اور راجن کی نکسیر نوٹ کی لیکن وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ اپنی گردان سے ہٹادیے ہاگر۔ نے پھر ہاتھ اٹھایا لیکن اس بار اسی کا جزء راجن کے ہاتھوں بیکار ہو گیا۔

راجن کا سارے پیچے کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی اس کی طرف جھٹے لیکن شاید راجن ٹوٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بے تباہ ایک طرف دوڑنے لگا... وہ دونوں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وفتحاڑا ہنی طرف کی جھاڑیوں سے ایک فائر ہوا۔ راجن نے بھاگتے بھاگتے چیخ کر ایک جست لکائی اور گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی کنپی سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا۔

تعاقب کرنے والے رک کر ایک دوسرا سے کامنہ دیکھنے لگے۔ پھر دونوں اس طرف جھٹے جدھر سے فائر ہوا تھا۔ جھاڑیاں سنان پڑی تھیں۔ البتہ ان میں بارود کی بیکنی سی بوچھلی ہوئی تھی۔ دونوں چد لمحے اوھر اور دھر دیکھتے رہے پھر راجن کی طرف لوٹ آئے جو خمٹدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے کارا کچھلا حصہ کھول کر پڑوں کے تین کنتر نکالے اور انہیں لاش پر خالی کرنے لگے۔

”تھے جانے کون تھا؟“ ناگر کے ساتھ والے نے کہا۔

”مسڑ کیوں (Q) کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“

”مسڑ کیوں؟“ دوسرا کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آخر یہ مسڑ کیوں ہے کون؟“

”کام کرو کام۔“ ناگر نے مظہربانہ انداز میں کہا۔ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھی چھٹاںک بھر سکتے نہ اتر جائے۔“

”یار میں نکل آگیا ہوں... اس کام سے۔“ دوسرا بولا۔

”معلوم ہوتا ہے.... یاد رکھی... موت منڈلار ہی ہے تمہارے سر پر۔“

پڑوں ڈال دینے کے بعد وہ لاش سے دور ہٹ گئے۔ پھر ناگر نے ایک دیا مسلمانی سلاک کر لاش

کی طرف اچھا لدی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہاں آگ ہی آگ تھی۔ والپی پرانہ کار میں ایک پرچہ ملا جس پر تحریر تھا ”اپنے کام سے کام رکھو! اور حکم کی تعیین کرو! مسٹر کیو کے متعلق کچھ ہے۔ موت کو دعوت دینا ہے۔“

حمدید پاگل خانے میں

سرجنٹ حمید نے چیخزے لگا کر کھے شے۔ آنکھوں میں دھشت تھی اور شیو بڑھا ہوا انہیں بال بے ترتیب تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان میں برسوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ سر میں خس و خاکھار اور گرد و غبار کا عالم یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ حقچا پاگل ہو۔ چہرے پر متعدد چھوٹے چھوٹے زخم تھے جن پر کھر نہ جنمے گی تھی۔ اس کے شناساؤں میں سے اگر کوئی اُسے اس حال میں دیکھ لیتا تو ہرگز ز پیچاں سکتا۔

وہ تین دن سے اس موقع پر شہر بھر میں مارما را پھر رہا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اُسے پاگل خانے بھجوادے۔ لیکن وہ ابھی تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اس نے متعدد شرارتیں کی تھیں مگر لوگوں نے اسے پاگل خانے بھجوادی نے کی جائے اس کی حرکتوں میں خاصی دلچسپی لی۔ عموماً اس کے پیچھے ہر وقت چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاصی بھیز ہوا کرتی تھی۔ اس نے فریدی سے کہا کہ اس در درسری سے کیا فائدہ، براہ راست اسے پاگل خانے میں بھجو دیا جائے۔ لیکن فریدی نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ فریدی کا کہنا تھا کہ بجمم بہت منظم معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی پوری ایکسیم پر پانی پھیر سکتی ہے۔

جس دن سے ان دونوں پر حملہ ہوا تھا فریدی بہت زیادہ حکماں ہو گیا تھا۔ خود روپوٹی اختیار کر کے اسی نے ڈی۔ آئی۔ جی سے استدعا کی تھی کہ وہ ڈاکٹر نارنگ سے مل کر حمید والے معاملے کی تحقیق کرے... اور یہ معاملہ قابو کافی روشنی میں آچکا تھا کہ وہ لڑکی جو حمید کو اس عمارت میں پہلے نظر آئی تھی کرنل فرید کی روپوٹ بہن نادرہ ہی تھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ڈاکٹر نارنگ کے نیجے سے جو پتہ حاصل کیا تھا وہ سرے علی سے بیکار ثابت ہوا۔ اس عمارت میں ناگر نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا تھا اور فلیں دنیا میں بھی کوئی اس نام سے واقع نہیں تھا۔ نہ کوئی نامی کسی ایکٹریں ہی کا سارا

بل کا اور اس بھر نے تو ڈی۔ آئی۔ جی کی رہی کسی امیدوں پر پانی ہی پھیر دیا کہ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے نیجے کو اسی دن بر طرف کر دیا تھا۔ بہر حال اب راجمن کی بھی تلاش جاری تھی۔

ان دو تین دنوں کے دوران میں حمید کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ حقچا

پاگل ہو گیا ہو۔ وہ قریب ہر وقت دعائیاں کرتا تھا کہ اے پاک پروردگار اپنی پاگل فرست میں پاگل خانے بھجوادے۔ ورنہ یہ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے چلنے والے شریر بچے مجھے کچھ باغی بنا دیں گے۔ اپنی ایکسیم کامیاب ہوتے تھے دیکھ کر اس نے کئی بار سچا کہ اب عورتوں کو بھی چھینا شروع کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کو چھیرنے والے کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاتا خواہ پاگل آدمی ہو خواہ پاگل کتا۔ بعض اوقات تو لوگ ایسے پاگل کتے کو بھی مار مار کر آدمی بنا لیتے ہیں۔

آج صبح ہی سے وہ ادھر ادھر اچھل کو دھچاتا پھر رہا تھا۔ کسی کو مسکرا کر آنکھ مارتا، کسی کو منہ چڑھا اور کسی کو چوچ دکھاتا۔ صبح ہی صبح اس نے سب سے پہلی شرارت یہ کی تھی کہ ایک چورا ہے انجام دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ ناخن اسی کر گزرتی ہوئی کاروں کو گزرنے اور رکنے کے اشارے کرتا۔ ذرا سیور ہنس نہ کر اسے گھونسہ دکھاتے اور گزرنے جاتے۔

وہ تقریباً آدمی ہے گھنٹے تک بھی کرتا رہا۔ پھر ڈریوٹ والا اٹریک کا نیسلیں آگیا اور اس نے بدقت تمام اسے چھوڑتے سے ہٹایا لیکن وہ بھی اسے پاگل خانے بھجوادی نے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ حمید دل یہ دل میں اسے گالیاں دے کر وہاں سے بہت گیا۔

لیکن آج اس نے تمہیر کر لیا تھا کہ وہ پاگل خانے ضرور جائے گا۔

بڑے چوک میں پیچ کر کچھ اُسے اپنی قسمت جاگتی معلوم ہونے لگی۔ اس نے ڈسٹرکٹ محتریٹ کو دیکھا جو اپنی کار سے اتر کر فٹ پاٹھ پر چڑھ رہا تھا۔ حمید نے سوچا کہ یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مرتے دم تک پاگل خانے کا دیدار نصیب نہیں ہو گا۔

”ہائے جانی سنو تو کسی۔“ حمید ڈسٹرکٹ محتریٹ کے پیچھے لپٹتا ہوا بولتا۔

ڈسٹرکٹ محتریٹ چلتا رہا۔

”اویلی ہیت... پٹ میری جان... ہائے رک جانی... نیلی ہیت... نیلی ہیت۔“

نہلے پاگل خانے کے منتھلوں نے اس بیگانے کو فرو دیا۔
تھوڑی دیر بعد حمید کا طبی معافانہ شروع ہوا جو اتنی جلدی اور لاپرواٹی سے ختم کر دیا گیا کہ
یہ کو جھرت ہونے لگا۔

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ محسریت کے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ البتہ اس کے ڈائیور نے پھر ہر حال ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا کہ وہ ایسا پاگل نہیں تھا جسے کہیں الگ باندھ کر رکھا
کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔

وہ صحنی ٹوپی پر مشتمل تھا۔

اسے باغ میں نئی کیاریاں کھو دنے اور کھاد دالنے پر لیگا دیا گیا۔

حمید کی نظریں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔
اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی اُسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بار بار گھورنے لگتا تھا کہ
فرانہیں پاگل کیسے سمجھ لیا جائے۔ وہ سب نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے کاموں میں

اُسے ڈپنسری والے سائبان کے نیچے ایک قنپر بھاٹا دیا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی بے صرف تھے۔

دنعتاباً غ کے باہر اس جگہ شور سنائی دیا جہاں کچھ پاگل رسیاں بٹ رہے تھے۔ حمید اچھل کر
فرانہ گیا۔ ایک پاگل ایک درخت کے بتنے سے چھٹا ہوا جیخ رہا تھا۔ ”مار ڈالوں گا... سالے
کو... دھست تیری کی...!!“

وہ اپنا سینہ تھے سے ٹکائے زور کر رہا تھا۔ پاگل خانے کے دو محافظ اُس کی طرف جھپٹے۔ پہلے

”ابے... اجعے... یہ کیا کر رہا ہے۔“ سائبان کے نیچے سے لگی نئے لکڑاں
”بھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔“ ان صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرق اشیا تو اس پر کوڑے بر سانے

کر کے کہا۔ مگر وہ درخت سے لپٹا ہوا اور پھر کچھ دیر بعد یہوں ہو کر گر پڑا۔ ڈپنسری سے
ثریوں کر دیئے۔

وہ دوسرا آدمی بھی بجوتے پر چڑھا آیا۔ اس کے چہرے پر بھی ڈاڑھی لہر ارہی تھی۔

”اُنہیں کاموں میں مشغول ہو گئے۔“

”آس کے لاشور میں بچپن ہی سے ظالمانہ رحمات پرورش پاتے رہے ہیں۔“

حمدید بوكھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ پچاس بچپن سال کا ایک قوی الجثہ آدمی تھا۔ چہرے
پر بھٹی اور بڑی ڈاڑھی تھی۔ پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی۔ آنکھیں غنماں اور دھنبدی تھیں تاکہ
کو جوڑ پر نظر آنے والا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب سے پہلے بھی چشمہ لگاتا رہا ہو گا۔

ڈسٹرکٹ محسریت پلٹ پار

حمدید نے سینے پر ہاتھ مار اور اسے آنکھ مار کر مسکرا نے لگا۔

”مری جان.... اب ترجم کرو، عاشق دلگیر پر۔“

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ محسریت کے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ البتہ اس کے ڈائیور نے پھر
کر حمید کی گردن پکڑ لی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔

اس طرح اسے پاگل خانے پہنچنے کا موقع نصیب ہو گیا۔

پاگل خانے کے چھانک کے قریب ہی اندر کی جانب ڈپنسری تھی جس کے آگے نہیں

کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ حمید نے بے شمار آدمی دیکھے جو انتہائی سنجیدگی سے کسی نہ کسی کام میں مشغول

تھے۔ کوئی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ کوئی ہندی کی باڑھ کتر رہا تھا۔ کوئی ری بٹ

تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ پاگل تو کسی طرح نہیں ہو سکتے۔

اُسے ڈپنسری والے سائبان کے نیچے ایک قنپر بھاٹا دیا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی بے صرف تھے۔

تو نگے تھے اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گئے۔ حمید کا دل دھڑ کئے لگا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچنے

تھا کہ وہ خود بھی تو پاگل ہے۔ اگر کسی سے ہاتھ پالی کی نوبت آگئی تو اسے تکلیف نہ کرنا پڑے گی۔

وہ صاحب تھوڑی دیر میں حمید کو گھورتے رہے پھر انہیوں نے کو لے ہے بلانڈ شروع کر دیئے۔

”ابے.... اجعے.... یہ کیا کر رہا ہے۔“ سائبان کے نیچے سے لگی نئے لکڑاں

”بھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔“ ان صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرق اشیا تو اس پر کوڑے بر سانے

کر کے کہا۔

وہ دوسرا آدمی بھی بجوتے پر چڑھا آیا۔ اس کے چہرے پر بھی ڈاڑھی لہر ارہی تھی۔

”آنکھوں میں بلاکی سنجیدگی تھی۔“

”زم...!!“ اس نے اپنی ڈاڑھی پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ہلا کی جاتی ہے.... اگر

تک تمہارا دماغ صحیح نہیں ہوا۔“

پھر ان میں سے ایک ڈاڑھی پلا تارہ اور دوسرا کو لے ہے مٹکا تارہ۔

حمدید نے اٹھ کر ناچنانشروع کر دیا۔ عافیت اسی میں نظر آئی۔ آخر وہ بھی پاگل ہی تھا۔

جو لوگ ادھر ادھر کاموں میں مشغول تھے وہ بھی ایک ایک کر کے اٹھا ہوئے گے۔

”لا شور جوان جلوں کا گوارہ ہے۔“ اس نے ایک پاگل کو خاطب کر کے کہا۔ ”سنریج“ پاگل نے نفی میں سر ہلا دیا اور پہلے پاگل نے کہا۔ ”ایک قسم کا منطقی شور بھجو لو۔“ بھی کہ سکتے ہو۔ منطقی شور دراصل جلوں کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں مختلف قسم کی عمارتیں تھیں۔ بعض عمارتوں میں اسے کیا سمجھو گے۔ خیر اسے یوں سمجھو میں اس وقت ناچنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہ ناچنے پڑے۔ یہاں کوئی یاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخوں والے دروازے تھے۔ ان میں غالباً خطرناک قسم منطقی شور کہتا ہے کہ تم یونیورسٹی کے پروفیسر ہو۔ تمہیں ہرگز ناچنا چاہئے۔۔۔ لیکن میر کے پاگل رکھے جاتے ہوں گے۔ ایک بہت بڑا مین کا شدید بھی تھا۔ جس کے نیچے بے شمار پلٹک تھے شروع کر دیتا ہوں۔“

اس نے پیچھے گاگا کرنا پڑا شروع کر دیا۔
جید سوچ رہا تھا کہ اسے بھی پاگل پن کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرنی چاہئے لیکن پھر انہوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرز گئی۔

انہوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرز گئی۔
دنخاۓ سے قریب ہی کہیں بھیں کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دھمک ٹھک کر اپنی انگلی مردوڑ تا اور شرماتارہ اور ساتھ ہی گھنی ڈاڑھی میں فاشہ ہو۔ ایک نیم کے درخت سے پیچھے رگڑ کر بھینوں کی سی آوازیں ٹکال رہا تھا۔ جید چوک پڑا۔ کی طرح مکرانے کی کوشش بھی کرتا جا رہا تھا۔

”شراپ۔“ ایک محافظ کا کوڑا اس کی پیچھے پڑا اور وہ تملک کر دو ہوا ہو گیا۔ جب محافظ ہبھی تھا۔ تو اس نے گھنٹوں میں منہ دیکھ بھوک کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔
جید سوچ رہا تھا کہ یہ پاگل بھی غیر شوری طور پر جابر قتوں سے خائف رہتے ہیں ورنہ جیسے ہی جید اس کے قریب پہنچا اس نے جھپٹ کر اس کے سینے میں سر اڑا دیا اور پیچھے کی محافظ بس اس کے ایک ہی تھپڑ کافی ہوتا۔ وہ حقیقت کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا کچھ اُرف رہنے لگا۔ جید نے قدم جمادیے تھے۔ اس نے اس کا سر اپنے بازوؤں میں جکڑ کر آہستہ سے نہیں کہ اس کا پروفیسر والا حوالہ درست ہی رہا ہو۔

تو ہوڑی تھوڑی دیر بعد مختلف حصوں سے شور امتحا پھر ”شراپ شراپ“ کی آوازیں ہیں۔ ساجد ترپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ وہ اُسے جیرت اور خوف کے مطابق انداز اور سکوت طاری ہو جاتا۔
بے گھور رہا تھا۔

شام ہو گئی لیکن وہنہ ملا جس کی جید کو علاش تھی۔ پانچ کے گھنٹے کے ساتھ ہی کام روکو۔ کرفل کی اڑنے والی رائفل نے وزیر خزانہ کا خون کر دیا۔ جید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے تھا۔ لیکن اب بھی بعض ایسے تھے جو کام ہی سے چھٹے رہنا چاہتے تھے اور انہیں کام سے الگ کرنے کے لئے کہا۔ ”نادرہ! بھی تک غائب ہے۔ اب تمہیں بولنا ہی پڑے گا اور اگر نہیں بولو گے تو بہت تھے تو ایک پاگل نے جید کے قریب آکر آہستہ سے کہا۔

”کل تک میرا گونسلہ مکمل ہو جائے گا اور پھر میں اُن کراس میں جا چھپوں گا۔۔۔ اٹھے۔“ ”میں کوئی بھی ہوں۔ لیکن تمہیں بولنا ہی پڑے گا۔“

”میں کچھ نہیں۔۔۔ نج... جانتا۔۔۔ میں پاگل۔۔۔!“

”تو نہ پاگل!۔۔۔ پاگل تو میں بھی ہوں۔“ جید مکرا کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہاں

گا۔ پیچ نکالوں گا۔۔۔ چوں۔۔۔ چوں۔۔۔ چرچ رچ رچ رچ۔۔۔!“

پھر وہ راستے بھر چوں چوں چرچ رچ رکتا گیا۔

میڈیکل شٹ قاعدے سے ہوتا ہی نہیں۔ محض پچھلی ہسٹری دیکھ کر پاگل پن کی قسم کا تجزیہ کر کے نمبر لگادیے جاتے ہیں۔ چلو بیٹھ اگلو جلدی اس قسم کی حرaxonی ہر ملکے میں ہو رہی ہے۔

”میرا... شائد... میرا وقت بھی قریب آگیا ہے۔“ ساجد آہستہ سے بڑا بڑا۔

”تو کیا تم نے ہی کرتی کو قتل کیا تھا۔“

”نہیں! ہرگز نہیں۔“

”پھر تمہاری موت کیوں قریب آگئی ہے۔“

”مار ڈالو... مار ڈالو... لیکن مار ڈالنے سے پہلے کسی بلی کی طرح مجھے چوہا سمجھ کر کمیت۔“ ساجد نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

”جب تم مجرم نہیں ہو تو تمہیں کس بات کا ذریعہ ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہلاڈ نہیں مجھے۔“ ساجد کا عپتا ہوا بولا۔ ”مارنا ہے تو مار ہی ڈالو... اب تو تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“

”حید اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک جھپٹ میٹھنے کا اس پر جو رد ہوا تھا وہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔“

”تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔“ حمید اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور وہ چیخ کر پیچھے ہٹ پڑا۔

”میرا تعلق ملکہ سراغِ رسانی سے ہے۔“ حمید پھر بولا۔

ساجد کسی خوفزدہ شکاری کی طرح دبک رہا تھا۔

”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں بیہاں سے نکال کر پولیس والوں کے سپرد کر دیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”نہیں... نہیں!“ ساجد مضطربانہ انداز میں بولا اور تھوڑی دیر تک اسے غور سے دیتے کے بعد کہنے لگا۔

”وتم مسٹر کیو کے آدمیوں میں سے نہیں ہو۔“

”مسٹر کیو؟“ حمید حیرت سے بولا۔ ”یہ کون بلا ہے۔“

”مجھے بچاؤ۔“ ساجد بچوں کی طرح سکیاں لیتا ہوا بولا۔

”ڈرو نہیں!“ حمید زرم لجھے میں بولا۔ ”یہ مسٹر کیو کون ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”تم نے پھر وہی ضد شروع کر دی۔“

”خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہو۔
بہر حال مجرموں کا ایک جم غیر اس کا تابع فرمان ہے۔“

”اور تم بھی انہیں میں سے ایک ہو۔“

”مم... میں۔“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”غیر اور نہیں۔ تم سرکاری گواہ بنا کر چھوڑ دیے جاؤ گے۔“

”میں بھیں بہتر ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”شاید مسٹر کیو مجھے بیجع عدالت میں بھی زندگی چھوڑتے۔“

”اوہ...! تو کیا وہ ایسا ہی خطرناک آدمی ہے۔“

ساجد صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔

”وہ ہزاروں آدمیوں کا شہنشاہ ہے۔“ ساجد تھوڑی دیر بعد بولا۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ ایک کا دوسرا سے کیا تعلق ہے۔“

”ہوں۔“ حمید نر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا! تم کس طرح اس کے چکر میں پھنسنے تھے۔“

ساجد نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے پچاہت ظاہر ہو رہی تھی۔

”میں دراصل! مجھ سے ایک بار ایک جرم سرزد ہو گیا تھا جس کے متعلق میں یہ سمجھتا تھا کہ اس پر بیمیشہ پر دھڑا رہے گا۔“

”چلو میں تم سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”لیکن....!“ ساجد بولتا رہا۔ ”مسٹر کیو کو اس کا علم تھا۔ اس نے مجھے بلیک میں کیا۔ مجھے اس کی طرف سے ایک خط ملا جس میں اُس جرم کی تفصیل درج تھی اور مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر میں نے مسٹر کیو کی ہر خواہش کے آگے گرنے جھکا دیا تو اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے گی۔“

”تو تم نے اسے کس طرح مطلع کیا تھا کہ تمہیں منظور ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ٹیلی فون کے ذریعے! اس نے مجھے نمبر لکھا تھا۔... کہ اگر مجھے منظور ہو تو اس نمبر پر فون کر دوں۔“

”نمبریا دھے؟“ حمید نے کہا۔

”ہاں.... تھری زیرد۔“

”تھری زیرد!“ حمید جرأت سے بولا۔ ”یہ تو میلی فون ایکچھی کا نمبر ہے۔“

”میں جانتا ہوں.... لیکن نمبر یہی تھا۔“ ساجد بولا۔

”پھر....؟“

”پھر اس نے مجھے دوسرا خط کے ذریعہ کر غل فرید کے یہاں سیکرٹری کی جگہ حام کرنے کی کوشش کا حکم دیا۔“

”اسی رائقل کے لئے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.... لیکن کر غل فرید بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی، دوسرا جرأت انگیز بات یہ کہ کر غل فرید بھی مسٹر کیو کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قتل سے تین چار دن قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ دو تین ایسے خوط لگ گئے؛ مسٹر کیونے اسے لکھے تھے۔ بہر حال مسٹر کیو کو بھی اس پر اعتماد نہیں تھا اس نے مجھے اس کے پیچے کو شش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیو ہی نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“ میں کہا گیا تھا کہ میں رات کر غل فرید کے گھر پر نہ رہوں۔ مسٹر کیو کا وجود مجھے عرصہ سے الجھ میں ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس کا سراغ لگاؤں۔ چنانچہ میں نے اس سے حکم کی تعییں نہ کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس نے یہ حکم کیوں دیا ہے میں کر غل کے مکان ہی میں چھپا رہا اور تقریباً بارہ بجے رات کو کسی نے پیچے سے میرے سر پر کوئی دزنجی چیز ماری اور میں بیٹھ ہو گیا۔ دوسری صبح میں نے خود کو ایک کمرے میں مقفل پایا اور باہر پولیس والوں کے بھاری بھر جو توں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے کچھ قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نبڑی طرح گھبرا گیا۔ پولیس والوں سے زیادہ مسٹر کیو کا خوف دیکھیر تھا۔ لہذا فوری طور پر اس سے علاوہ اور کچھ نہ سوچا کہ پاگل بن جاؤں۔“

ساجد خاموش ہو گیا۔ حمید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”آخر وہ لوگ اس کی بہن کویوں لے گئے۔“

”وہ اس رائقل کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ شائد استعمال کا طریقہ بھی اسے ملتا۔“

”خدا۔“ ساجد نے کہا۔

”کیا وہ لڑکی بہت کم خن تھی۔“

”بہت زیادہ۔“ ساجد نے کہا۔

”اس کی چال کیسی تھی؟“

”چال ہی تو سب کچھ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی چال نہیں دیکھی ایسا معلوم ہوتا ہے

”جیسے وہ زمین سے کچھ اوپر تیر رہی ہو۔“

”مسٹر کیو! اس کے ساتھیوں کے متعلق اور بھی کچھ جانتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں! بتایا کہ میں تقریباً چھ ماہ تک کر غل کے ساتھ رہا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوا کہ

کہ وہ بھی مسٹر کیو ہی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید اسے بھی میرے متعلق علم نہ رہا ہو۔“

”لیکن تمہیں اس کے ساتھ ملازمت کس طرح مل گئی۔“

”مسٹر کیو کے خوف نے دلائی تھی وہ ملازمت۔ ظاہر ہے کہ اگر میں وہ ملازمت حاصل نہ

کر سکتا تو میرا بھائیو اپھوٹ جاتا۔ جس کی دھمکی مسٹر کیو پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہذا میں نے سر توڑ

کو شش کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیو ہی نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“

”لیکن تم کہہ چکے ہو کہ کر غل نے تم پر رائقل کا راز کبھی نہ ظاہر ہونے دیا۔ اس کا تو یہ

مطلوب ہوا کہ وہ تمہاری حقیقت سے واقف تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ قطعی واقف نہیں تھا۔“ ساجد بولا۔

”بہر حال اُس رائقل نے ایک بہت بڑے آدمی کی جان لے لی۔ خراب تم کیا کہتے ہو۔“

”یہیں زہنا چاہتے ہو یا کوئی اور انتظام کیا جائے۔“

”نہیں میں یہیں بہتر ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ حمید دیر تک کھڑا

اندھیرے میں گھورتا رہا۔

رنگ اور بھنگ

دوسری صبح سر جنٹ حمید بہت مضھل تھا۔ پاگلوں کے خوف سے اُسے رات بھر ٹھیک سے

نیند نہیں آئی تھی اور دیے بھی سوتا ہی کہا۔ اس کیلئے خاص طور پر کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ پورے پاگل خانے میں بد نظری ہی بد نظری نظر آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں کے عملہ دماغوں میں بھی فور ہے۔ اُسے رات بھر ایک درخت کے تنے سے بیک لگائے بیٹھا رہا پڑا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ پاگل پھر بار کوں اور سائیں انوں سے جانوروں کی طرح ہاٹ دیئے گئے اور اُنکی مشینیں پھر چل پڑیں۔ ان کی آنکھیں ویران تھیں اور چہرے ہر قسم کے جذبات سے بُرے عاری۔ صرف ان کے جسم حرکت کر رہے تھے۔ جب بھی ان میں سے کسی کے ذہن کی رو بیکتی ہے اس پر کوڑے برستے لگتے اور جب وہ درد سے بے تاب ہو کر چیختا ہے بھی اس کے چہرے پر تکلیف کے احساس کے آثار نہ ہوتے۔ آنکھیں بدستور ویران اور کھوئی کھوئی ہوتیں۔ اس یہ معلوم ہے جیسے یہ آواز کسی مشین ہی سے نکلی ہو۔

جید پھر اپنے پچھلے ہی دن والے کام میں آگا۔ بھوک کے مارے براحال تھا۔ پچھلی رات بھی اُسے بھوکا ہی رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ ابھی ہوئی پتلی اور بدبو دار دال باجرے کی سخت روٹیوں ساتھ حلق سے نہ اتاری گئی تھی۔ بہر حال اب اُسے خوف تھا کہ کہیں اس بھوک کی حالت میں مخافتوں کے کوڑے نہ کھانے پڑیں۔ آج اسے ان لوگوں میں ساجد بھی دکھائی دیا جو ایک نیم درخت کے نیچے چٹائی بن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا وہ تقریباً دو گھنٹے سے سر جھکائے بیٹھا چڑیاں بن رہا تھا۔ وہ بھی بھی کسی خوفزدہ گید کی طرح سر اٹھا کر اپنی پشت کی طرف دیکھنے لگا اس کے قریب ہی کچھ اور بھی تھے۔ وہ بھی اس ر طرح خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً جید نے ایک جیخ سنی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساجد اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک پاگل پر ٹوٹ پڑا۔ قل اس کے کہ مخافتوں کی طرف دوڑتے اس کا سر کئی بار شم کے تنے سے ٹکرایا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے کسی بگڑے ہوئے کتے کی سی غرابہ بھی نکل رہی تھی۔ دو مخافتوں بھی بُری طرح بھٹکوڑا۔ کئی مخافتوں نے اسے رسیوں سے جکڑ کر ان بار کوں ز طرف روانہ کر دیا جہاں خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے تھے۔

جید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اب جیچ پاگل ہو گیا ہے۔ یا پھر یہ مسٹر کیوسے محفوظ رہنے لئے دوسری حکمت عملی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب اسے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا جائے گا اور جید

بت تک باہر نہ نکلا جائے گا جب تک ڈاکٹروں کو یقین نہ ہو جائے کہ وہ اب کسی پر حملہ نہیں کرے گا۔

ہنگامہ فرو ہونے کے ایک گھنٹے بعد ایک محافظ حمید کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ نیچے جھک کر شلوک کی پشت پر پڑے ہوئے نمبر دیکھئے اور حمید سے اٹھنے کو کہا۔
”پپ... پیاواں۔“ حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”چل بے۔“ اُس نے حمید کی گردن پکڑ کر دھکا دیا۔ حمید چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ڈپندری کے سامنے کے نیچے ایک آدمی کھڑا ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ حمید کی طرف دیکھ کر مستکرایا۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ فریدی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمال کا بھیں بدلا ہے ظالم نے... مسٹر کیوں کیا مسٹر کیوں کا باپ بھی اسے نہیں پہچان سکتا۔ فریدی نے اس سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بُرے کسی طرح اسے پاگل خانے سے نکال لائے گا۔ حمید نے دل ہی دل میں تقدیمہ لگایا اور سوچنے لگا۔ آج پھنسنے ہو دوست۔ مری جان۔ فریدی صاحب۔ اب کم از کم چار گھنٹے پریشان کئے بغیر نہ ماںوں گا۔

”آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر صاحب سے درود ناک آواز میں کہہ رہا تھا۔
”یہ میرا سگا بھائی ہے اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بُری مشکل سے ڈسٹرکٹ محسٹریٹ صاحب اس پر راضی ہوئے ہیں۔“ پھر وہ حمید کی طرف ٹڑ کر بڑے پیار سے بولا۔
”بُو میاں۔“

”بھائی جان۔“ بُو میاں سلمہ جھپٹ کر اُس سے لپٹ گئے اور وہ گھبرا کر چیچھے ہٹ گیا۔ حمید نے دل میں سوچا کہ غصب کا ایکٹر ہے۔ اس گھبراہٹ میں کتنا بے ساختہ پن تھا۔ یہ گھبراہٹ کتنی قدر تھی۔ اگر سگا بھائی بھی پاگل ہو جائے تو لوگ غیر شوری طور پر اس سے خائف ہی رہتے ہیں۔

”ماننا ہوں استاد۔“ حمید نے دل میں کہا۔ ”مگر میں تمہیں بُنگ ضرور کروں گا۔“ وہ اپنے ساتھ کپڑے بھی لایا تھا۔ سفید کرتا اور پاچا سہ۔ پاگل خانے کے کپڑے اتر والے گئے پاگل خانے کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ حمید اچھل کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار چل پڑی۔ حمید اس کی پیٹھ پر رہا تھا پھر پھر کر اُسے چکار رہا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ حمید

سونج رہا تھا کہ شاید فریدی اس کی افتاد طبع کی بناء پر خاموش ہے۔ سوچتا ہو گا کہ اگر میں نے بوس میں پہلی کی تو حمید نچائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ خیر صاحب دیکھتا ہے کہ یہ خاموشی کتنی دیر تاریخی ہے۔ حمید سونج رہا تھا کہ وہ ان تکالیف کا گن گن کر بدلتے گا جو اسے پاگل خانے میں اخراج پڑیں تھیں وہ اوگھتا اور سوچتا ہا۔۔۔ ذیروہ دن کی تھکن اور پچھلی رات کی بیداری کے اثرات اس کے ذہن پر حاوی ہوتے گئے اور وہ سیٹ کی پشت سے لگ کر خراۓ لینے لگا۔
پھر اسی وقت اس کی آنکھ کھلی جب اسے جھبھوڑ کر جگایا گیا۔

کار ایک عالی شان عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کار سے از کر ادھر اور ہر دیکھنے لگا۔ پچھے بولنے ہی والا تھا کہ اپنی شرارت والی اسکیم کا خیال آگیا۔

”غورر... غورر... غرج...!“ اس نے حلقت سے آواز نکالی اور اپنی دانت میں فریدی کے ساتھ گھسنے لگا جو اس کا ہاتھ تھا سے اندر کھینچ لئے جا رہا تھا۔

متعدد راہداری کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچ اور پھر حمید کی رو جمع فنا ہو گئی۔ کمرے کے وسط میں وہی جبشی طالوت کھڑا تھا۔ جسے اس نے اپنی الف لیلی والی رات و ڈاکٹر نارنگ کے بنگل میں دیکھا تھا۔ اس کا مر چکرانے لگا لیکن... وہ سونج رہا تھا کتنی زبردست غلطی ہوئی اب اسے سچ فریدی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگر اس نے یقین طور پر کوئی ڈھنگ کی بات بتا دی ہوتی تو وہ مجرموں کے ہاتھ میں کیوں پڑتا۔۔۔ مگر... خیر... اس نے شروع ہی سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی بناء پر اسے پاگل نہ سمجھا جاتا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں اب تک اپنیا گل پن برقرار رکھا تھا اور یہاں سے نکل بھاگنے کا بس ایک بھی حریب رہ گیا تھا۔ حمید اپنے دل و دماغ کو متوقع اور غیر متوقع ہر قسم کے حادثات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت ارادی کے تحت منظم کرنے لگا۔ حمید کے ساتھی نے اسے طالوت کی طرف دھکیل دیا۔ طالوت اپنے بے چوڑے بازو پھیلائے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ حمید نے اس کے جسم سے ٹکراتے ہی گردان میں ہاتھ ڈال کر دو عدد بو سے اس کے رخادریوں پر رسید کر دیے۔

طالوت کی گرفت ڈھکلی پڑ گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ حمید چاروں خانے چت زمین پر گرا۔ طالوت جرت سے آنکھیں پھاڑے حمید کو گھور رہا تھا۔ حمید پھر اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا۔ طالوت نے اپنے دونوں ہاتھ آگے طرف تان دیے۔ جبشی براقد آور تھا۔ حمید شاید اس سے

کندھوں سے بھی بیچارہ ہو۔ طالوت اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور حمید اس لئے بار بار اچھل رہا تھا کہ شاید دو چار بوسے اور نصیب ہو جائیں۔ ویسے اسکے منہ کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ شخص جو حمید کو اپنے ساتھ لایا تھا بے تھاش قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اچاک وہ سنجیدہ ہو کر انگریزی میں غریا۔ ”یہ بنا ہو پاگل ہے۔ تمہیں اسے راہ راست پر لانا ہے۔“

”نبیں.... نبیں....!“ جبشی غالط سلطان انگریزی میں چیخ۔ ”یہ سچا گل ہے۔“

”بکو نہیں! اسے ٹھیک کرو۔“

”کیوں.... تم جھوٹے پاگل ہو۔“ جبشی نے کھیانے انداز میں پوچھا۔
”بھوں.... بھوں۔“ حمید کے کی طرح بھوکھنے لگا۔ جبشی کا منہ چوم لینے کی کوشش ابھی تک جاری تھی۔

”تیا کے بچ۔“ جبشی نے بھس کر اس کی گردان دبو پھی اور حمید چوٹ کھائے ہوئے کتے کی طرح ”چیاوس چیاوس“ کرنے لگا۔ طالوت پر بھسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ حمید کو چھوڑ چھاڑ کر الگ ہٹ گیا۔ کبھی پیسٹ دباتا اور کبھی منہ۔

”خاموش خاموش۔“ دوسر آدمی حلق پھاڑ کر چیخ۔

طالوت کی بھسی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ حمید اب دوسرے آدمی کی طرف جھپٹا۔ پہلے تو اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ لیکن دوسرے لمحے میں سنجھل کر اس نے جو ایک ہاتھ جھاڑا ہے تو میاں حمید کو دن میں تارے نظر آگئے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا لہذا تو اوزن برقرار رکھ کر سکتے کی بناء پر ڈھر ہو گیا۔ لیکن وہ بھی طے کر پکا تھا کہ چاہے جان چلی جائے نکلت نہیں تسلیم کروں گا۔ وہ جھپٹ کر پھر اٹھا اور سبھی حرکت دہرا دی۔

جبشی پیسٹ دباتے پورے کرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ حمید کی اس حرکت نے تو اسے بے دم کر دیا۔

”میا ہڑا ہے۔“ دوسرے کرے میں ایک تیز قسم کی نسوانی چیخ سنائی دی اور ایک لڑکی اندر گھس آئی۔ لیکن اب حمید اپنے چہرے پر تھجھ کے آٹا پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حمید اسے نظر انداز کر کے طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہوا جبشی ہی کے پیچھے دوڑ تارہ۔

”طالوت۔“ دوسرے آدمی نے اسے پھر لالکارا؟ ”خاموش رہو! اور نہ گولی مار دوں گا۔“

اچاک وہ سہم کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دراصل اب اس میں بہنے کی سکتی نہ رہ گئی تھی۔

نے سوچا کہ اب تھوڑی سی خدمت اس لڑکی بھی کرنی چاہئے۔

اس نے ذرماں انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور قدیم ہندوستانی رقص کا ایک پورا۔

ہوا لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ پھر اس کے بعد سچک کے بول بولتا ہوا جو ناچا ہے تو ایک ساتھ کل، بھارتیہ نائیم اور منی پور کے دہ دہ پینترے دکھائے ہیں کہ جب شی پر تو گیا ملک الموت ہی سے ہو گیا۔ لڑکی بھی ہنس رہی تھی اور وہ دوسرا آدمی بھی ہستا تھا اور کبھی جھنجھلا کر پیر پیٹھنے لگتا۔

”یہ پاگل نہیں ہے..... ہرگز نہیں ہے۔“ وہ حلق کے بل چیخا اور حمید کا گریبان پکڑ لیا۔

پاگل نہیں ہو۔ میں تمہاری کھال اڑا دوں گا۔“

حید نے دانت نکال کر قبھر لگایا جو اتنا بیانی قسم کا تھا کہ لڑکی خوفزدہ آواز میں جیخ پڑی۔

دفعنا قریب ہی کسی کمرے میں فائز کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شیشوں کے ٹوٹ کر گرے

سے چھٹا کے بھی پیدا ہوئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں حید نے پ

قبھر لگایا۔ وہ سمجھا شاید پوپس آگئی۔

”لے د کھو۔“ دوسرے آدمی نے جب شی سے کھا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل آی۔

راہداری میں رک کر وہ دونوں شاید اندازہ لگانے لگے کہ آواز کس کمرے سے آئی تھی۔ پھر،

ایک کمرے میں گھس گئے۔ سامنے والی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا تھا اور کمرے

میں بارود کی بوچیلی ہوئی تھی۔ مرد کی نظر سامنے والی میز پر پڑی جس پر ایک یوتل رکھی تھی“

جھپٹ کر اس کے قریب آیا۔ یوتل کے نیچے ایک کافنڈا کا مکڑا بابا ہوا تھا جس پر کچھ تحریر تھا وہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”کیا ہے؟“ لڑکی اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

”مشرکیو۔“ اس نے سر گوشی کی۔ لڑکی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن اس نے اس

ہاتھ پکڑ لیا۔

”اس کی سزا موت ہے۔“ وہ سکھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مشرکیو کو دیکھنے کی خواہش ہی جرم ہے۔

”ہوں! جیسے میں جانتی نہیں۔“ لڑکی بڑے ناز سے چک کر بولی۔

”نہیں..... تم نہیں..... جان سکتیں۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

”تم مشرکیو ہو۔“ لڑکی نے سمجھ دی گئی سے کہا۔

مرد نے ایک ڈراؤن اس قبھر لگایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہونے پھر اسی کرے میں آگیا جہا۔

جید کو چھوڑ گیا تھا۔ بوتل جس میں کوئی سیال شے بھری ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

یہاں حمید اور جب شی دنوں ہی تھک کر بیٹھ گئے تھے۔

”اے مضبوطی سے پکڑو۔“ اس نے جب شی سے کہا۔ حمید اس کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر پہلے

یورا تھا جب شی نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ ہاتھ پیر بلانا بھی مشکل نظر آئے۔ لگا۔

لڑکی کے سامنے نے بوتل سے عرق نکال کاں کر اس کے منہ پر چھینے مارنے شروع کر دیے۔ حمید محسوس کر رہا تھا کہ چہرے پر چکے ہوئے پلاسٹک کے نکڑے اپنی جگہ چھوڑ رہے

ہیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اب جان پکنی محال ہے۔ بہر حال وہ تن بہ تقدیر ہو بیٹھا۔

ایک ایک کر کے پلاسٹک کے سارے نکڑے نکال لئے گئے اور دفعتا وہ لڑکی جیخ جائی۔

”ارے..... یہ تم ہو! امر و بحث۔“

جب شی اُسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ حمید تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں..... میں..... سر جنت حمید؟.... اور اب واپس جا رہا ہوں۔“

حید دروازے کی طرف مڑا لیکن جب شی جھپٹ کر درمیان میں آگیا۔

”اس کا مطلب۔“ حمید لڑکی کے سامنے کی طرف مڑ کر بولا۔

”انپکڑ فریدی کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا لیکن تمہیں پچھتا اپنے گا۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیج کر بولا۔

”پاگل خانے کیوں گئے تھے؟“ اس نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہو کون؟“ حمید بگڑ کر بولا۔

مرد نے پھر جب شی کی طرف دیکھا اور اس نے حمید کو پکڑ لیا۔ حمید نے ترپن نہیں کیا تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ ہاتھ پیر مارنے کا وہی انجام ہو گا جو کسی دلدل میں پہنچنے ہوئے آدمی کا ہوتا ہے۔ وہ

اچھی طرح اندازہ لگا پکھا تھا کہ وہ جب شی کی قوت کا عشرہ عشرہ بھی نہیں رکھتا۔

”فریدی کہاں ہے۔“ مرد نے آگے بڑھ کر حمید کے منہ پر چھٹر مارا۔

حید حتی الامکان پر سکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ساتھ کوئی چلا آتیا۔" حمید نے اس سے پوچھا۔
وہ حیرت سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید یہ موقع نہیں تھی کہ حمید اتنا پر سکون
آئے گا۔

"میں جانتا تھا کہ تم ڈاکٹر ناگر ہو۔"

"پھر...؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس طرح کنوں سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔" بڑے
مسکرا کر بولا۔

کنوں اپنا خچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے خاموش کھڑی تھی۔ حمید کے اس جملے پر اس
چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"سنونا گر! یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہو۔ میں اس لڑکی کو تم سے چھین لے جاؤں گا۔" حمید
پھر کہا۔

"فریدی کہاں ہے۔" ناگر گرج کر بولا۔

"کنوں! میں وہ دلچسپ رات ابھی تک نہیں بھولا۔" حمید نے ناگر کی سُنی ان سُنی کرتے
بڑے پیدا بھرے لہجے میں کہا۔

اکی بار پھر ناگر نے ایک بھرپور بھاٹھ حمید کے منہ پر مارا اور حمید تو حقیقتاً اس وقت کمال
کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا رہا تھا سے تو یہ اور چوتھا کا کچھ احساس ہی نہ ہو۔

"میں پھر ہوں میرے دوست...!" اس نے قہقهہ لگایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں اس
باٹھ کی ڈرینگ نہ کرائی پڑے۔"

"میں تمہیں مارڈاں لوں گا۔" ناگر حلق کے بل پیچنے۔

"کوئی نئی بات نہیں۔ ہزاروں بار یہ جملہ سن چکا ہوں اور ہزاروں ہی لاشیں میں نے اپ
قد موز میں دیکھی ہیں۔"

"چیز ڈالوں سے۔" ناگر نے جبھی کو مخاطب کیا اور جبھی کی گرفت عجک ہونے لگی۔

حمد کو اپنی بہیاں کڑکڑاٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ حتی الامکان کو شش کر رہا تھا کہ
کا جسم ڈھیلانہ ہونے پائے۔ اپنے ذہن کو دور کے احساس سے بچانے کے لئے اس نے بڑے

شروع کر دیا۔

"کنوں! میں تمہیں اس جن کے... قبھے سے نکال لے جاؤں گا... یہ سہ کمپنی کا الجھٹ مل
گیا ہے۔"

"شٹ آپ...!" کنوں نے اسے ڈانٹا۔ پھر اپنے ساتھی سے کہنے لگی۔ "اس سے کیا فائدہ۔
تم غصے میں حکم کی تعلیم نہیں کر رہے ہو۔ مارڈاٹے کا حکم تو نہیں۔"

دفتاً ایسا معلوم ہوا جیسے ناگر ہوش میں آگیا ہو۔
"چھوڑ دو۔" اس نے طالوت سے کہا۔

اور حمید ایک صوفی پر جم گیا۔

"ایک سگریٹ پاڑو گے۔" اس نے بڑی لاپرواٹی سے ناگر کو مخاطب کیا۔
"میا یہ پاگل نہیں ہے۔" لڑکی حیرت سے بولی۔

"نہیں۔" ناگر کے لہجے میں سختی تھی۔

حمدیہ ہنسنے لگا۔ کنوں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں معلوم نہیں کہ تم قتل بھی کئے جا سکتے ہو۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔
"تمہارے لئے میں دس بار قتل ہونا منظور کرلوں گا۔" حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

ناگر کنوں کی طرف پلتا۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس کا لہجہ تھکمانہ تھا۔ کنوں کی پیشانی پر
ٹکنیں پڑ گئیں۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی بہلی سی جھلک دیکھی لیکن پھر وہ دوسرے
ہی لمحے میں مسکرا نہیں۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر حمید پر ڈالی اور کمرے سے چلی گئی۔

"میں نے تم سے ایک سگریٹ مانگی تھی۔" حمید نے ناگر کو مخاطب کیا۔ ناگر کے چہرے پر
شدید قسم کی الجھن کے آثار تھے۔ اس نے جب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر حمید کے سامنے ڈال

دیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے یہ حرکت بے خیالی میں ہوئی ہو۔

"مگر نہیں ایسی حالت میں سگریٹ پینے سے ممکن ہے مجھے غش ہی آجائے؟" حمید نے بڑا
کر کہا۔

"کیوں؟" ناگر نے چوک کر پوچھا۔

"میں کل رات سے بھوکا ہوں۔" حمید نے کہا۔ "پاگل خاؤں کی غذا ہوش مندوں کے لئے

جمید کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ترکیب نمبر تیرہ کیا پھر تھی۔ جب شی اُسے گود میں الٹا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ پھر اسکے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے گئے اور ناگر نے کوڑا سنچالا۔

چھلانگ لگانے والا

جمید کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندر ہیرا ہی اندر ہیرا تھا۔ پورے جسم میں کچھ اس قسم کی سوزش تھی جیسے اس کی کھال اتار کر کسی نے اُسے نمک کے ڈھیر میں بادیا ہو۔ پچاس کوڑے تک تو اس نے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ اُسے فریدی کے پروگرام کا علم نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے سب کچھ بتا ہی دیتا اپنی زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اتنی بے بی محسوس کی تھی لیکن پھر بھی یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کجھ میں آرہی تھی کہ فریدی اس کی طرف سے غافل ہو گا۔

اچاکب ایک تیر قسم کی روشنی کا بڑا سادھہ اس کی پشت کی طرف اندر ہیرے میں ریگ آیا۔ جمید چوک پڑا۔ لیکن وہ اتنی ہی تیری سے مژہ سکا۔ کیونکہ جسم کو جبکش دینے کا خیال ہی اذیت ناک تھا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور سوچ آن کرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

یہ کنول تھی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح تردد تازہ نظر نہیں آرہی تھی۔ جمید نے اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑی اُسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی زمین پر دو زانو بیٹھ گئی۔

جمید نے پھر آنکھیں کھولیں اور تکلیف کی شدت سے اپنا چالا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ”تم بتا کیوں نہیں دیتے۔“ کنول نے سر گوشی کی۔

”میں نہیں جانتا۔“ جمید نے نجیف آواز میں کہا۔ ”اوہ اگر جانتا بھی ہوتا...“ ”یہ لوگ تمہیں مار دالیں گے۔“ کنول کی آواز دردناک تھی۔

قط్ٹی ناموزوں ہے اور پھر میں تو کھانے کی میز سے بعض اوقات مخفی اس لئے اٹھ جاتا ہوں۔ کسی ٹشتری سے کچے مسالے کی بونہ آتی ہو۔“

”تم پاگل خانے کیوں گئے تھے۔“ ناگر نے میساختہ پوچھا۔

”ایک آدمی کی تلاش میں! جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ بنا ہوا پاگل ہے۔“ جمید نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ چھپانا بے کار ہے۔ مجرم ان کی ایکیم سے واقع ہو گئے ہیں ورنہ وہ اس وقت یہاں نہ ہوتا۔

”لیکن یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی۔“ جمید بولتا رہا۔ ”کیونکہ آج ہی اس نے ایک دوسرے پاگل کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے اور اب اُسے خطرناک پاگلوں کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔“ ”تم اس سے ملے تھے۔“

”نہیں.... اُسے تو میں نے اس وقت پہچانا جب محافظ اُسے زنجروں میں جکڑے ہو۔ کوٹھری کی طرف لے جا رہے تھے۔“

”وہ کون ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔ ”تم آخر مجھے یہاں لائے کس لئے ہو۔“ جمید نے بات اڑا دی۔ ”اس رات کو مجھے یہ تو فون بنانے کا کیا مطلب تھا۔“

”دیکھو دوست....!“ ناگر زم لجھ میں بولا۔ ”بہتر ہی ہے کہ تم فریدی کا پتہ بتا دو۔ ورنہ یہ بڑی خراب جگہ ہے۔“

”اس کا علم یہاں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔“ جمید نے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں۔ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہیں۔“

”ہم لوگ بہت بُرے ہیں اور فریدی کا پتہ چاہتے ہیں۔“ ناگر مسکرا کر بولا۔ ”اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہیں معلوم، کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا۔“

”یہاں....!“ ناگر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”ضد کا نتیجہ موت ہی ہوا کرتی ہے۔“ ”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آج بھی مذاق ہی کر رہے ہو۔“ جمید نے ایسی سنجیدگی سے جس میں لاپرواہی بھی شامل تھی۔

”اے....!“ ناگر جب شی کی طرف دیکھ کر چینا۔ ”ترکیب نمبر تیرہ۔“

”کون؟“

”میں تمہارے لئے کپا کروں۔“ کنول کی آواز میں بے چینی اور بے بسی تھی۔
حید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کنول تھیر انداز میں دیکھنے لگی۔

”تم کیا کرو۔“ حید بولا۔ ”وہی کوڑا اٹھا لاؤ... اور تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

کنول نے اپنے دانت اتنی سختی سے ٹھیکھ لئے کہ جبڑوں کا گوشہ اُبھر آیا۔ شاید وہ آنسو ور
کے ایک پیساختہ قسم کے ابال کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ اس کی عمر
آنکھیں حید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”تم کل رات سے بھوکے ہو۔“ اس نے بھر سر گوشی کی۔

”ٹھیک یاد آیا۔“ حید مسکرا کر بولا۔ ”کیا تم آج مجھے وہی خواب آور دوانیں دے سکتیں
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے جسم پر دہکتے انگاروں سے لکیریں ٹھیکھ دی گئی ہوں۔“
وہ سچ مجھ روپڑی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے آنسو پوچھ ڈالے اور خوفزدہ نظرؤں سے
دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

کہیں دور بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی اور پھر حید
اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا سپاہی اٹھائے ہوئے نظر آیا۔ دیکھتے ہی کنول حید سے بلند آواز میں بولی۔

”میں کہتی ہوں تمہیں بتانا ہی پڑے گا ورنہ سکا سکا کرمار ڈالے جاؤ گے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ حید نحیف آواز میں بولا۔

جھٹی نے پیالہ کنول کے قریب رکھ دیا۔ چند لمحے غنوار آنکھوں سے حید کی طرف دیکھا
رہا پھر چلا گیا۔

کنول نے چچے سے حید کے منہ میں دودھ پکانا شروع کیا۔

”میں... تمہیں... اس جن... کے قبضے سے...“ حید رک رک کر بولتا رہا۔ ”ضرور
رہائی دلاؤں گا۔“

کنول کچھ نہ بولی۔

”مجھے یقین ہے۔“ حید اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا۔ ”اس میں بھی کوئی چا
لکھتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”تم مجھ سے ہمدردی جتا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو۔“

کنول نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ منہ سے تو پچھہ نہ بولی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی
تھیں.... اور حید کا دعویٰ تھا کہ مرتے دم تک عورتوں کی آنکھوں کی زبان سمجھتا رہے گا۔

”تم نے اس رات مجھے یہ تو قوف کیوں بنایا تھا۔“ حید نے ھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”نہیں بتا سکتی.... لیکن.... تم کسی طرح یہاں سے نکل جاتے تو اچھا تھا۔“

”کیوں....؟“

”یونہی۔“

”مسٹر کیوں کا خوف۔“ حید نے کہا اور کنول بے ساختہ اچھل پڑی اور اس کے بعد اس سے جو
فل سرزد ہوا وہ قطعی اضطراری تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کی طرف گئی اور ادھر ادھر جھانک کر
پھر واپس آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوانیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ھوک ٹکل کر آہستہ سے بولی۔

”خاموش رہو... تم....!“

”باہر کوئی ہے۔“ حید نے پوچھا۔

اس نے نقی میں سر ہلا دیا اور پھر بیٹھ کر اس کے حقوق میں دودھ پکانے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ وہ ھوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں کسی کے سامنے اس کا نام نہ لینا ورنہ اسی
وقت ختم کر دیجئے جاؤ گے۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے۔“

”کسی نے نہیں دیکھا۔“

”تم اس کے پھندے میں کس طرح پھنسیں۔“

”یہ سب مت پوچھو۔“

”تاگر کون ہے!“

”یہاں سے نکلنے کے لئے کچھ سوچو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تمہارا نام کنول ہے یا کچھ اور۔“

”یہی ہے! یہی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”تم اتنے مطمئن کیوں ہو۔“

لی۔ گوشہ گوشہ چھان لیا گیا لیکن حمید کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ حمید گھری نیند سو رہا تھا۔ پولیس والوں نے اسے اس کی کوٹھڑی سے نکال کر ڈرانگ روم کے ایک صوفے پر ڈال دیا۔ پھر وہ عمارت کی تلاشی لینے میں مشغول ہو گئے اور انہیں اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ وہ حمید کو تھا چھوڑ آئے ہیں۔ کو تو ای انجارچ انپکٹر جلدیں کے ساتھ دو سب انپکٹر تھے اور وہ تمیوں اس کا میابی کے خیال میں مگن تھے کہ ہر قسم کے خدشات سے گویا محظوظ ہی ہو گئے تھے۔

جب وہ تلاشی لے کر پلے تو ان کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ ڈرانگ روم خالی اور حمید غائب تھا۔ وہ پھر دیوانوں کی طرح پوری عمارت میں پھیل گئے۔ لیکن لا حاصل حمید کا کہیں پہنچ نہیں تھا۔

حمد کو یقین تھا کہ اس کی نیند خود بخود نہیں ٹوٹی کیونکہ آنکھیں کھلتے ہی اسے اپنے منہ میں کسی کڑوی یا کسلی چیز کا مزہ محسوس ہوا اور ایک خاص قسم کی بو بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ کراہ کراہ بیٹھا۔ بترا بہت ہی نرم اور پر تکلف تھا اور ملائم تکیوں سے ویسی ہی خوبصورتی تھی جیسے وہ اپنے تکیوں کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کراہ بھی وہ نہیں تھا جس کے فرش پر چلتے لیے اس نے کنوں کے ہاتھ سے دودھ پیا تھا۔ اس کی نظریں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر ریگ گئیں۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔۔۔ لیکن یہ کیا؟ چاندنی کی کرنیں زمین پر مچھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ ایسی تجھ بخربات تھی کہ وہ اپنی تکالیف کا احساس کئے بغیر اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جھپٹ کر کھڑکی کے قریب پہنچا لیکن دوسرے ہی لمحے میں دل چاپا کہ اپنے منہ پر تھپٹر مارے۔ چاندنی کی کرنیں زمین پر نہیں بلکہ دریا کی لمبی پر نچل رہی تھیں۔ کھڑکی سے تقریباً سو بارہ فٹ پیچے دریا ہے رہا تھا۔ وہی طرف اسے پل نظر آیا اور پھر وہ کشم ہاؤس کی عمارت کو بھی پیچان گیا شاید وہ اسی عمارت کے کسی کوارٹر میں تھا۔ دفعتاً اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز ستائی دی اور وہ چونکر مرزا دروازے میں ایک آدمی نظر آیا جس کی شکل حمید کے لئے نئی تھی۔

”ڈرو نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا اور حمید اس کی آواز پیچان کراچھل پڑا۔

”یہ فریدی تھا۔“

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”آپ کے پاس ریوال ہو گا؟“

”میں ہر حال میں مطمئن رہتا ہوں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”تب تم بھی جن ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنوں نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

چوڑوں کی تکلیف معمولی نہیں تھی لیکن حمید کسی طرح بھی یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ”خوفزدہ ہے یا اس نے کوڑوں کی اس بارش کو ذرہ برابر بھی اہمیت دی ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو۔“ حمید اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا پیار بھرے لبھے میں بولا۔

”تم کچھ امر و بخت ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنوں مسکرا پڑی۔ ”کچالو بن گیا ہے تمہارا گھر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔“

”اگر اس وقت منہ میں دودھ نہ ہوتا تو کچالو کے نام پر پانی بھر آیا ہوتا۔“

کنوں صرف مسکرا کر رہا گئی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ ساجد کی بات نیک ہی تکلی کسی ”مسٹر کیو“ کا وجود ضرور ہے اور یہ لوگ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ کرٹل کی بہن نادرہ سے متعلق بھی پوچھے لیکن فوراً خیال آگیا کہ وہ اپنی پاگل خانے والی ناکامی کی داستان ناگر کو سنا چکا ہے۔ اس کا ذہن پھر بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ پیالے کا دودھ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اس کر کنوں کو روک دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی اس کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفیت تر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ حمید نے نیند کے دباؤ سے جھکتی ہوئی پلکوں کو زبردستی اٹھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شکریہ! میرے لئے یہی بہتر ہے۔ آج کی خواب آوز دو ازیادہ فائدہ مند ثابت ہو گی۔“

اور پھر وہ سو گیا۔ کنوں تھوڑی دیر بیٹھی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر انٹھ کر چلی گئی۔ وہ راہداری کے موڑ پر پہنچی تھی کہ کسی سے نکل آگئی۔ پیالہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

یہ ناگر تھا اور بُری طرح بد حواس نظر آرہا تھا۔

”پولیس...!“ وہ ہاپنٹا ہوا بولا۔ ”طالبوت کہاں ہے۔“

”باؤر پی خانے میں۔“

”چلو...!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتا ہوا بولا۔ ”پولیس نے گھیرا اڈاں دیا ہے۔“

باؤر پی خانے سے انہوں نے طالوت کو لیا اور ایک تاریک تاریک راہداری میں گھستے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں پوری عمارت پولیس والوں کے بھاری قدموں کی آواز اسیوں سے گھٹے گئے۔

اور کون ہیں؟ اس کا پتہ نہیں۔ میں نے بھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ان کا پتہ گاؤں۔ وہ بھی بہر حال سرکاری ہی آدمی ہیں۔“

”اور ان کا میلی فون نمبر بھی تھری زیرو ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں...!“

”اور یہی میلی فون نمبر ایکچھے کا بھی ہے۔“

”ہاں؟ اور شاید یہی چیز تمہیں الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”قطعی...!“

”مسٹر کیو کے لئے میلی فون ایکچھے میں خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ مسٹر کیو کے لئے کوئی کال آتے ہی نہیں فون آپریٹر اس کا سلسلہ ایک رائسمیٹر سے ملادیتا ہے۔ اس طرح ایکچھے سے مسٹر کیو کے لئے میلی فونک رائمشن ہو جاتا ہے اور آپریٹر تک کو اس بات کا پتہ نہیں چلتے پاتا کہ یہ کال کہاں کے لئے آئی تھی۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ سیکرٹ سروس والے ہی...!“

”نہیں حمید صاحب۔“ فریدی مفطر بانہ انداز میں بولا۔ ”اتنی جلدی کوئی فیصلہ صادر کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد ایسا کیس ملا ہے جس میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی درزشیں کرنا پڑیں گی۔“

وہ خاموش ہو کر سگار سلاکا نے لگا اور حمید بولا۔

”حمدی صاحب! اگر اپنی کھال میں صحیح سلامت رہے تو؟“

”یار مجھے حقیقتاً ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا کہ تم اس حال کو پہنچ گئے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر آپ کا یہ افسوس میری بیٹھ کی سوزش نہیں کم کر سکتا۔“

”مگر یہ تو سوچو کہ کنول نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”بھیں کا دودھ پلایا تھا۔“ حمید جلدی سے بولا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ.... راجن.... ڈاکٹر نارنگ کی دیکھی جائیداد کا مثیج کہاں غائب ہو گیا؟“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اوہ....!“ حمید متاسفانہ لمحے میں بولا۔ ”مجھے اس کے متعلق کنول سے پوچھنا چاہئے تھا....“

”ہاں! کیوں؟“ فریدی کے لمحے میں جرت تھی۔

”تھوڑی دیر کے لئے ادھار دے دیجئے۔“

”کیوں؟“

”میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو گولی مار دوں۔“ حمید حق پھاڑ کر چیخا۔

فریدی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور اس کا شانہ ٹھپکتا ہوا بولا۔

”اگر تم اس وقت مجھے توپ سے بھی اڑا د تو میرا ناون گا! میرے اچھے بیٹے۔“

”ذریا پیٹھ دیکھئے میری۔“

”میں دیکھ چکا ہوں.... اور اس کے لئے ان کا جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیر ڈالوں گا۔“

فریدی نے اسے پلٹک پر لادیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر حمید اپنی

داستان بیان کر چلا۔ حالانکہ اس نے سب سے پہلے اسی کے متعلق معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ یہاں

تک کیسے پہنچا۔ لیکن فریدی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ خود اپنی رواداد پہلے سنائے۔ جیسے ہی حمید نے

مسٹر کیو کا نام لیا فریدی تقریباً چھل پڑا۔ وہ تھیر خیز نظرؤں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”پچھے نہیں.... کہتے چلو.... پھر بتاؤ گا۔“

حمید نے بیان جاری رکھا اور جب وہ خاموش ہوا تو فریدی نے پوچھا۔

”وہ لڑکی.... لیعنی نادرہ بھی کہیں نظر آئی تھی۔“

”نہیں.... لیکن مسٹر کیو کے نام پر جو کئے کیوں تھے۔ کیا آپ پہلے سے اس کی شخصیت سے

واقف ہیں۔“

”ہاں.... لیکن اس کی اس حیثیت کے متعلق شاید خواب میں بھی نہ سوچ سکتا۔“ فریدی نے

خیال انداز میں بولا۔

”لیعنی....!“ حمید کے لمحے میں جرت تھی۔

”اس نام کا تعلق سیکرٹ سروس والوں سے ہے۔“

”آپ انہیں جانتے ہیں۔“

”میں صرف ان کی تعداد جانتا ہوں۔ وہ پانچ ہیں اور یہی نام استعمال کرتے ہیں کہاں ہیں۔“

خیر....اب آپ بتائیے کہ یہ کم بخت شہزادہ امر و بخت....کپالو خصال بن کر یہاں تک کیسے پہنچا۔
”حقیقتاً اس حادثے کی تمام تزدہ داری مجھ پر ہی ہے۔“ فریدی نے کہا اور پھر اپنے جو تے اتر کراطمنا سے پیش تھا ہوا بولا۔ ”میں نے تمہارے پاگل خانے پہنچنے والے واقعے کو شہرت دی تھی۔“

”شہرت دی تھی۔“ حمید حیرت اور غصے میں بولا۔

”جس لئے شہرت دی تھی اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن ایک جگہ دھوکا کھا گیا۔... خیر....
بہر حال میں نے اس لئے اس معاملے کو شہرت دی تھی کہ مجرموں پر اس کا رد عمل دیکھ سکوں۔
میں جانتا تھا کہ وہ تم پر قابو پانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ ایک آدمی نے ڈسٹرکٹ
محسٹریٹ کا جعلی اجازت نامہ بنایا اور اسے لے کر پاگل خانے پہنچ گیا۔ تم نے پاگل خانے کے
تحوڑے فاصلے پر ایک دوسرا کار بھی دیکھی ہو گی جس کے پیچے گراپ واٹر کا اشتہار لگا ہوا تھا وہ
میں نے اس کمپنی سے اس مقصد کے لئے حاصل کی تھی۔... بہر حال میں نے اس پر تم دنوں کا
تعاقب کیا۔“

فریدی رک کر سگار سلاگا نے لگا۔

”اور اس کے باوجود آپ اتنی دیر میں پہنچ۔“ حمید بھٹا کر بولا۔

”سنست تو جاؤ! اس عمارت کے سامنے پہنچ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس
میں مغربی جرمی کا سفیر رہتا ہے اور وہیں اس کا دفتر بھی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ ایسے موقع پر
جس قسم کی کاروائیاں ہوتی ہیں۔ میں نے نگرانی کیلئے ریشم اور حمید کو دہاں کر دیا اور خود ڈی۔ آئی۔ جی۔
کے پاس پہنچا۔ بہر حال دہاں کی تلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں دیر ہو گئی اور پھر جب دہاں
گھیرا دالنے کا انتظام کیا جا رہا تھا تو اچاک یہ اطلاع میں کہ عمارت دراصل خالی ہے۔ سفیر کا دفتر کئی
دن ہوئے کسی دوسرا عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ دھوکا دراصل اس لئے کھا گیا کہ دہاں سے
سفارت خانے کا بورڈ نہیں ہٹایا گیا تھا یا ممکن ہے کہ خود مجرموں ہی نے دوسرا لگادیا ہو۔ بہر حال
باہر تو بورڈ لگا ہوا تھا اور اندر ایک جگہ ایک تختی پر لکھا ہوا ملا۔ کرانے کے لئے خالی ہے، خیر....
بے چارے جگد لیش وغیرہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم پھر مجرموں کے ہاتھ میں پڑ گئے۔
”خوڑی دیر تک خاموش رہی پھر حمید بولا۔

”تو وہ لوگ گرفتار ہو گئے۔“

”کہاں.... کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاس کا۔ البتہ ابھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے دو
جھنچے تک جھک مارنے کے بعد ایک پور دروازے کا پتہ لگایا ہے جو ایک پتلی سی گلی میں کھلتا ہے اور
بھر کسی نے دھیان تک نہیں دیا تھا۔ یعنی اور پولیس نہیں تھی۔“
اور بھی کام کر رہا ہے یا نہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں نے ابھی تک تو اسے بلا�ا نہیں۔“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”سب کو ایک ساتھ
بڑا دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کیس بڑا چیزیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ تازہ دم لوگ بھی
بوجوڑیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیں۔ فی الحال.... میں نے یہ انتظام
لایا ہے کہ ملک بھر میں اس وقت تک ماٹکروں فون استعمال نہ کیا جائے جب تک ایک پرسٹ یا اطمینان
نہ کر لیں کہ اس میں کوئی دوسرا سٹم بھی تو نہیں پایا جاتا۔“

”ملک بھر میں....؟“ حمید حیرت سے بولا۔

”جناب.... یہ کوئی ملک گیر تنظیم معلوم ہوتی ہے۔“

کچھ دیر خاموش رہی پھر فریدی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ داتوق پیسے آجائے گا۔ کیونکہ اس سٹر کو نے برا بھی طریقہ اختیار کیا ہے۔“

”لیکن آپ تو سیکرٹ ہر دس...!“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی حمید کی بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ سیکرٹ سروس
والے اس قسم کی کوئی حرکت کریں گے۔ اس کیس میں یہی تو ایک اہم نکتہ ہے میرا خیال ہے کہ وہ
پانچ سیکرٹ سروس والے دوسرا دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔“

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی ان کا نام استعمال کر سکے۔“

وہ دنوں پھر خاموش ہو گئے۔ فریدی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور حمید کا ذہن نیند کے تانے
بانے میں الجھتا جا رہا تھا۔ دفعتا وہ فریدی کی آواز سن کر جو نک پڑا اور ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا جیسے
پیچے دریا میں کوئی وزنی چیز کافی اوچائی سے گری ہو۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھتا فریدی کھڑکی
میں چڑھ کر دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ حمید پہلے تو اچل کر کھڑکی کے قریب گیا پھر دروازے کی
ٹرف بھاگا۔ آگے ایک چھوٹا سا سچن تھا۔ حمید دروازہ کھول کر مکان کے باہر آخیا۔ باہر سناتا تھا۔

غایل رات آدمی سے زیادہ گرچکی تھی۔ گھٹ بھی بالکل سنا اور پل پر آمد و رفت بھی ہو چکی تھی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ شاید ایک منت تک بے حس و حرکت کھڑا دریا کی سطح پر نظریں جماں رہا۔ کچھ دوسری بڑی بڑی لہریں گرداب کی شکل میں اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی سیاہ سی چیز سطح پر ابھرتی اور ڈوب جاتی۔

حمد کا جسم اور دماغ دونوں ہی تقریباً بیکار تھے۔ یہاں تک وہ محض اضطراری فعل کے تھے پہنچا تھا اور اب اسے ایک منت کھڑا ہوتا بھی دو بھر معلوم ہو رہا تھا۔ صرف ایک سوال اس نے ڈھن میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہتے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فریدی نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی تھی۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محوس کیا کہ کوئی تیرتا ہوا اسی طرف آرہا ہے۔ فریدی نے کنارے پہنچ کر کسی دوسرے آدمی کو پانی سے کھینچ کر باہر نکالا۔

خوفناک آنکھیں

فریدی اسے کاندھے پر اٹھائے ہوئے گھر کے اندر چلا گیا۔ حمید اس کے پیچے تھا۔ روٹ میں پہنچتے ہی حمید کی آنکھیں جھرتے سے پھٹی رہ گئیں۔ فریدی نے اسے فرش پر ڈال کر اس پیٹ سے پانی نکالنے کی تدبیریں شروع کر دی تھیں۔

”ہیلو...!“ دفتارہ رک کر بولا۔ پھر مزکر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا یہ وہی نہیں ہے جو تمہیں پاگل خانے سے لے گیا تھا۔“

”ناگر...!“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی بدستور مشغول رہا۔ اس نے اس کے گیلے کپڑے اتار کر اسے ایک چادر میں پیٹ دی۔ حمید کھڑکی کے قریب کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ بھی کوئی چاہ تو نہیں۔ پھر وہ صحن کی طرف جھپٹا اور باہر کے دروازے میں کندی لگا کر واپس آگیا۔ فریدی کو پر بیٹھا ہے ہوش آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی دو اوں کا بکس فرش پر کھلا رکھا تھا اور اس کے اپنے ہاتھ میں انجلشون والی سرخ سنجال رکھی تھی۔

”تم کھڑے کیوں ہو؟“

”ہمیں غالباً نہ رہنا چاہئے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔“

”جو کچھ بھی ہے ابھی ظاہر ہو جائے گا۔“ فریدی پر سکون لجھ میں بولا۔ ”تم اس آرام کر سی

پلیٹ جاؤ۔۔۔ مگر نہیں تمہاری بیٹھے اس قابل نہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ.... اچھا ذرا ادھر آؤ۔“

پھر وہ اسے برآمدے میں لا کر بولا۔ ”اسے شاید دو تین منت بعد ہوش آجائے۔ جب تک

میں نہ کہوں تم اس کے سامنے مت آتا۔ یہاں اس پنگ پر لیٹ جاؤ۔ بلکہ سو جاؤ تو بہتر ہے۔“

”میا۔۔۔ آپ نے اسے کو دیکھ لیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس نے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔“ فریدی بولا۔

”پتے نہیں کیا بات ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ یہ مسٹر کیوں ہی کا کسی قسم کا عتاب ہو۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔۔۔ اس نے

برآمدے میں پڑے ہوئے پنگ کی طرف اشارہ کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

ناگر کو ہوش آگیا تھا۔ وہ پنگ پر چلتا تھا اور انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فریدی

پر نظر پڑتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا باہر اس طرح

اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے دفتار اس کی پیٹائی ہی رخصت ہو گئی ہو۔ وہ نبڑی طرح کانپ رہا

تھا۔ ”مجھے جہنم میں جھوک دوا میں خود ہی کوڈ جاؤ گا۔۔۔ مگر میرا قصور۔۔۔ مجھے میرا قصور بھی

تو ہے۔۔۔ یا پھر مجھے مر ہی جانے دو۔۔۔ اس طرح اوہی ورم موت۔۔۔ ایک چوہے کی طرح بے بس نہ کرو۔“

وہ خاموش ہو گیا پھر دھنٹا حلقت پھڑا کر چینا۔ ”شام تھے۔“

”سن لیا۔۔۔!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ ناگر نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے

ہوئے کھل۔

لیکن وہ اب بھی فریدی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی اقدام خود کشی نہ کرو گے تو میں تمہیں پولیس نکلے خواہ نہ کرو۔“ فریدی ایسے کہا۔

ناگر نے ایک لمحے کے لئے فریدی کی طرف دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں۔

”میاں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے خود کشی کی کوشش کیوں کی تھی۔“ فریدی پھر بولا۔
”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ناگر نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔

”یعنی تم ارادتا نہیں کر رہے تھے۔“ فریدی اسے پر خیال انداز میں دیکھ رہا تھا۔
”بچھے جانے دو۔“ ناگر اٹھتا ہوا بولا۔

”جاو...!“ فریدی کے ہونتوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ اسے شرات آئی
نظر دیں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا لیکن شاید اس بار کسی روپ اور کی گولی کو تمہارے سینے کا راستہ ٹھیک
کرنا پڑے۔

ناگر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر پنگ پر گر کر اپنا برہنہ جسم چاڑ
سے چھپا نے لگا۔

”ڈرو نہیں!“ فریدی نرم لمحے میں بولا۔ ”تم اب قطعی محفوظ ہو۔ یہاں میری موجودگی میں
کوئی تم پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ویسے میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ تم دریا میں خود کو دے تھے
کسی نے تمہیں پھینکا تھا۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”پھر وہی ضد...!“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے ذہن میں صرف بھی ایک خیال تھا کہ کوڈ جاؤں میں کوڈ گیا۔
اور وہ تمہارا اپنا خیال نہیں تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میا...؟“ ناگر پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”بھی کہ تم خود سے نہیں کوڈے تھے۔“

”تم کون ہو؟“ ناگر خوفزدہ آواز میں بولا۔

”ڈرو نہیں! میں ان میں سے نہیں جھوٹوں نے تمہیں چلا گا لگانے پر مجبور کیا تھا۔“

”پھر آخر کون ہو۔“

” بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور میز پر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر اسے دیتا ہوا بولا۔ ”انہیں
چکن لو۔“

ناگر نے تمہیں اور پتلوں پہنچی! لیکن اس کی تحریر آمیز نظریں بار بار فریدی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ فریدی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
جیسے ہی ناگر کی نظر حید پر پڑی وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر فریدی سہارے کئے لئے اپنا بازو آگئے نہ
کر دیتا تو اس کا سر دیوار سے تکرا گیا تھا۔
حید بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب بتاؤ بیٹے ناگر صاحب۔“ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
ناگر نے آنکھیں بند کر لیں۔

”غائب... اب تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
”پولیس...!“ ناگر کا پنچا ہوا بولا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ فریدی نے حید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”مگر تم پر یہ ساری
میںیں اس کی وجہ سے نازل ہو گئے تھیں۔“

”کیا...؟ مم... میں نہیں سمجھا۔“ ناگر ہکلایا۔

”تم نے اسے پولیس والوں کیلئے چھوڑ دیا تھا اور خود فرار ہو گئے تھے۔ لہذا تمہارے مسٹر کیو...!“
ناگر کی ایک بے ساختہ قسم کی جیج نے فریدی کا جملہ نہ پورا ہونے دیا۔

”تم جھوٹے ہو۔“ ناگر نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے میں بھاگ گیا۔
پھر فریدی اور حید نے بدھوایی کے عالم میں اسے پنگ کے نیچے گھستے دیکھا۔

”لب...!“ حید نے تھہر لگایا۔ ”چلو خیر! میں تمہیں سول پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑتا
ہوں۔“ فریدی نے اسے بدقت تمام پنگ کے نیچے سے نکالا۔

”تم... تم... مسٹر کیو کے آدی ہو۔“ ناگر ہنیانی انداز میں بک رہا تھا۔ ”میں کہیں نہیں بچ
سکتا کسی طرح نہیں بچ سکتا۔“

”تو تمہیں اسی طرح یقین دلایا جاسکتا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“ فریدی
نے کہا۔

”جھوٹ... بلف... دھوکا... مسٹر کیو کا نام اسکے آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔“
”لیکن اس کا نام مسٹر کیو تو نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس نام سے بھی کوئی واقعہ نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس کے ساتھیوں کے علاوہ دو اور آدمی بھی ہیں جو اس نام سے واقف ہیں۔“

”کون؟“

”انپکٹر فریدی اور سرجنت حمید۔“

”تت... تو... آپ... مسٹر فریدی... ہیں۔“ ناگر کے لجھ میں حیرت تھی۔

فریدی مسکرا تارہا۔ ناگر تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

”تو پھر... خدا کے لئے... مجھے کسی بند گاڑی میں جیل خانے بھجواد بیجئے... ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا... اور میں نے ابھی تک کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا موت ہو۔“

”تم یہاں ہر طرح محفوظ رہو گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بشرطیکہ جو کچھ پوچھوں اس کا حق چھوڑو۔“

”میں سب کچھ کروں گا۔ مجھے پھایے۔“

”تم جانتے ہو کہ مسٹر کیوں حقیقتاً کون ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”اے کبھی دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“

”اس رات جب تم نے سرجنت حمید کو ڈاکٹر نارنگ کے یہاں بے وقف بیالا تھا تمہارے ساتھ لکھنی لے کیا تھیں۔“

”وو...!“

”جو حمید سے پہلے ملی تھی کون تھی؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم سے میں اسے وہاں لے گیا تھا۔“

”تمہارے پاس وہ کب سے تھی۔“

”اُسی دن آئی تھی۔ جس دن میں وہاں گیا تھا۔“

”وہ کہاں سے آئی تھی۔“

”میں یہ بھی نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم کے مطابق میں نڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اب تک۔“

بند گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ لڑکی... جب شی... اور کنوں... تینوں مجھے اس میں ملے تھے۔“

”کنوں کون ہے۔“

”اس نے مجھ سے آج تک نہیں بتایا۔“

”ڈاکٹر نارنگ کے غیر راجن سے تمہاری جان پچان کس طرح ہوئی تھی۔“

”مسٹر کیوں کے حکم کے مطابق میں نے اس سے دستی پیدا کی تھی۔“

”کیا راجن بھی اُسی کے آدمیوں میں سے تھا۔“

”کہہ نہیں سلتا... ہو سکتا ہے کہ رہا ہو۔ مسٹر کیوں کے گروہ کے لوگ ایک دوسرے کو اس وقت تک نہیں جانتے جب تک کہ مسٹر کیوں خود نہ چاہے۔“

”راجن تمہیں اس کے بعد ملائھا۔“

”رر... راجن...!“ ناگر ہکلا کر رہ گیا۔

”جھوٹ نہیں سنوں گا۔“ فریدی اب سے تیز نظروں سے گھوڑتا ہوا بولا۔

”اُسے مسٹر کیوں ختم کر دیا۔“

”کیسے؟“

”مجھے مسٹر کیوں کی طرف سے حکم ملا کہ میں راجن کو دلاور گروہ والی سڑک سے لے کر جھریاں کے جنگل میں مارڈاں دیں۔ مدد کے لئے ایک آدمی بھی دیا گیا تھا۔ حکم تھا کہ لاش کو پڑوں چھڑک کر جلا دیا جائے۔“

”تو تم دونوں نے اسے مارڈا۔“

”نہیں...!“ ناگر گھبرا کر بولا۔

”پھر...؟“

”جب وہ ہم سے چھٹ کر بھاگ رہا تھا تو کسی نے سر کنڈوں کی جھاڑپوں سے اس پر فائر کر دیا۔ لیکن لاش ہمیں ہی جلانی پڑی تھی۔“

”دوسرے آدمی کون تھا۔“

”پتہ نہیں... اسی دن پر کے بعد سے اب تک نہیں دکھائی دیا۔“

”خراب یہ بتاؤ کہ تم اس کے چکر میں کس طرح پڑے تھے۔“

نگر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔“

پھر اس نے اسی قسم کی ایک داستان دہرا دی جیسی حمید کو پاگل خانے میں ساجد نے سننا تھی۔ ناگر دراصل نشیات کی ناجائز تجارت کرتا تھا۔ مسٹر کیونے اسے ایک خط کے ذریعہ دھرم دی تھی کہ اگر اس نے اس کے احکامات کے آگے سرنہ جھکا دیا تو وہ اس کاراز فاش کر دے گوئے۔ اسے بھی بھی بدایت ملی تھی کہ وہ اپنے فیصلے سے فون کے ذریعے آگاہ کرے۔ نمبر وہی ”فرز زیر و“ تھا۔

”ٹیلی فون کرنے کے متعلق کوئی اور بھی بدایت ملتی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.... کہ گفتگو شخصی ٹیلی فون کی بجائے کسی پیلک ٹیلی فون بوجھ سے کی جائے۔“

”اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو یا مشورے کے لئے کون ساطر یقہ اختیار کیا گیا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”مسٹر کیوں کے خطوط یا تو بزریہ ڈاک آتے ہیں یا کسی دوسرے نہ اسرار طریقے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔“

”نہ اسرار طریقے سے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں.... آج ہی! جب میں آپ کے ساتھی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مسٹر کیونے مکان کے ایک حصے میں فائر کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کرے میں گئے تو ہمیں اس کا خط ملا اور ساتھ ہی ایک بوتل بھی جس میں غالباً سیال ایمونیا تھی۔ خط میں بدایت تھی کہ میک اپ بگانے کے لئے بوتل کا عرق استعمال کیا جائے۔“

”اوہ....!“ فریدی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھاگی۔

”وہ لاک کی کہاں ہے.... کنوں....!“ حمید نے پوچھا۔

فریدی اسے گھورنے لگا اور حمید نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔

”کنوں.... میں نہیں جانتا کہ وہاں کہاں ہے۔“ ناگر نے کہا۔

”لیکن تم تیوں ساتھ ہی تو بھاگے ہو گے۔“ فریدی بولا۔

”ہم وہاں ساتھ ہی پہنچتے جہاں ہمیں خطرات کے وقت پناہ لینے کا حکم ملا تھا۔ اس کے“

”میں بھاگ پڑا آیا۔“

”کہاں گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔ لیکن ناگر نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔
”میا... میں یقین کر لوں کہ آپ میری حفاظت کریں گے۔“ ناگر نے پوچھا۔
”تحت الامکان....!“ فریدی کا مختصر ساجاب تھا۔

”ہم لوگ! بیلی روڑ کی کوئی نہیں نمبر سترہ میں گئے تھے۔“
”کس کی کوئی نہیں۔“

”اس کا علم مجھے نہیں۔ پہلی ہی بار وہاں گیا تھا۔“
”پھر....!“

ناگر خاموش ہو گیا۔ اس پر پھر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔
”اس کی یاد بھی میرے لئے پریشان کن ہے۔“ وہ کامپتا ہوا بولا۔
”سنودوست!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ایک بات اور بھی واضح کرتا چلوں وہ یہ کہ مجھے ایکنگ اور حقیقت میں فرق کرنے کا کافی سلیقہ ہے۔“

”میں جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“ ناگر بولا۔
”خیر.... چلو....!“ فریدی سکار سکانا ہوا بولا۔

”وہاں اس عمارت کے ایک کمرے میں مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ایک دروازے کے نوٹے ہوئے شیشے سے دو خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ سرخ سرخ خونی آنکھیں۔ میری ہمت نہیں تھی کہ میں کسی طرح نظریں چڑا سکتا۔ میں ان کی طرف دیکھتا دھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ میرے جسم کی ساری طاقت ان خوفناک آنکھوں میں کھپتی جا رہی ہو۔ پھر مجھے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آوازان آنکھوں سے نکل رہی ہو۔ مجھ سے کہا جانا تھا کہ میں ایک بند گاڑی میں پلٹ تک جاؤں اور وہاں سے دریا میں چلا گا لگاؤں۔ میں خاموشی سے مڑا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے دریا میں چلا گا لگانی ہے.... اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پیدل بیلٹ تک جاؤں کا سفر کیا۔“

”تموزی دیر سکن خاموشی رہی۔ پھر فریدی تیز نکروں سے اس کے پیچھے کو ٹوٹا ہوا بولا۔“ اس آسمانی رائق کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“

”آسمانی را لکل... میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ تاگر نے کہا۔ ”کیا وہ بھی سُر کیوں...؟“ ”غائب...!“ فریدی اٹھ کر ٹھلتا ہوا بولا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں نے تمہیں اس سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو شاید میں تمہارے سُر کیوں بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوں۔“

”میں آپ کو کس طرح یقین دلاوں... میں...!“

تاگر کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ فریدی چونک کر پلان۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں ریو الور تھے اور ان کے پیڑے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

بموں کی بارش

فریدی کے سکون میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ اس کے ہاتھوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ پھیل رہی اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈڑائے کار پیرسل دیکھ رہا ہو۔

”مکان چھوٹا ہے۔“ اس نے سمجھی گی سے کہا۔ ”اور مہانوں کا تانبا بندھ گیا ہے۔“

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ آنے والوں میں سے ایک نے سر گوشی کی حید اور تاگر نے اپنے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن فریدی بدستور کھڑا مسکراہتا۔ تاگر بُرنی طرح کا تپ رہا۔

”مارنا مت۔“ دھلتا فریدی چیخا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے ان تینوں آدمیوں کے پیچے کھڑے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کیا ہو۔ تینوں چونک کر مڑے لیکن دوسراے ہی لمحے میں تینوں کے ریو الور زمین پر تھے اور فریدی ان پر پل پڑا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

”جید نے بے تباشہ چھلائیں لگائی اور زمین پر پڑے ہوئے ریو الوروں پر قبضہ کر لیا۔“

”ابے او گیدڑ کے پیچے۔“ حید نے تاگر کو لکارا۔ لیکن اس نے سر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کر دی۔ وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ فریدی ان تینوں نے کھماہو اٹھا۔

”ہیڈڑاپ۔“ حید آہستہ سے بولا اور فریدی انہیں چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور ان تینوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

تھوڑی دیر بعد حید اور تاگر انہیں رسیوں سے بکڑا ہے تھے اور فریدی ریو الور لئے کھڑا تھا۔ ”اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“ فریدی نے حید سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں ٹھہر و میں ابھی آیں۔“ وہ باہر چلا گیا اور حید قیدیوں کے چہروں سے نقاب فوچنے لگا۔

”ان میں سے کسی کو بیچانتے ہو۔“ حید نے تاگر سے پوچھا۔ تاگر نے فنی میں سر بلادیا۔

وہ تینوں سر جھکائے زمین پر بیٹھے رہے۔

”تمہیں کس نے بھیجا تھا۔“ حید نے انہیں مخاطب کیا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان میں سے دو تو خائف نظر آتے تھے۔ لیکن ایک کے پیڑے پر اب بھی خوفناک عزم کی جھلک تھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی اندر داخل ہوا۔ تینوں کو اٹھایا گیا۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

باہر کھڑی ہوئی کار میں انہیں دھکیل دیا گیا۔ اگلی نشست پر فریدی اور تاگر بیٹھے بھیپل پر جید تھا۔ میر موں میں سے دو نیچے تھے اور تیسرا سیٹ پر۔

”عقاب کا خیال رکھنا۔“ فریدی نے حید سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ حید پچھلے شیٹ سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ان کی کار جنگل کی طرف مڑ گئی۔

پل کے قریب والے کوارٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جاتے وقت اسے بند کرنے کی بھی رخصت گوارا نہیں کی تھی۔ ان کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک دوسرا کار کار آکر دہال رکی اور اس پر سے ایک آدمی نیچے اتر۔ اس کے علاوہ اس کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

اس نے بھی اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا اور ہر دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوارٹ کے دروازے کے قریب آگر رک گیا۔ شاید وہ آہستہ لے رہا تھا۔ اس نے جھاک کر اندر دیکھا۔ پھر ایک کنکری اٹھا کر کوارٹ کے اندر ورنی سائبیان پر پھیپھی۔ میں کا سائبیان چیخا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔

دوسرے لمحے میں وہ کوارٹ کے اندر تھا۔ صحن میں ایک کرسی الٹی ہوئی میں جس کا ایک پا یہ ٹوٹا ہوا تھا۔ تینوں قیدیوں کے نقاب فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور ایک غیب طرح کی آواز اس کے منہ سے نکلی جو کسی بھیڑیے کی غرابت سے بہت کچھ مشابہ تھی۔

پھر وہ برآمدے میں آیا چند لمحے اور ہر اور دیکھتا رہا۔ کرتے کا بلب روشن تھا۔

کمرے میں اسے ناگ کے بیکے ہوئے کپڑے ملے جنہیں اس نے بہت اختیاط سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کمرے کی مختلف چیزیں اللئے پلتے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ ناگ کے کپڑے کار میں ڈال دیئے۔ اگلی سیٹ سے ایک چھوٹا سا صندوق المخایا جس سے ایک بڑا ساتار لکھ رہا تھا۔ زمین پر جھک کر اس نے فریدی کی کار کے نشانات دیکھے اور وہ صندوق ایک پیچے کے نشان پر رکھ دیا۔ نثار کا سلسلہ موڑ کی بیٹری سے ملاتے ہی صندوق کی سطح روشن ہو گئی۔ صندوق کا اوپری حصہ دراصل شیشے کا تھا۔ اس کے وینچے ایک بڑی سی سوتی تھی جو آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ سوتی کے گرد پیش بے شمار چھوٹی چھوٹی آڑی، تر چھبی، اور سیدھی لکیریں تھیں۔ کہیں کہیں قوسیں، دائرے اور زاویے بھی نظر آرہے تھے۔ سوتی اپنا پکڑ پورا کرنے سے قبل ہی ایک جگہ رک گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار بھی اور ہر ہی جاری تھی جدھر فریدی کی گئی تھی۔

رات ڈھل رہی اور چاند افق کی طرف جھک رہا تھا۔ سانے کی چادر کا نشان پر محیط تھی۔ چھپوں کے جنگلوں میں گھستے ہی فریدی کو کار کی رفتار کم کر دینی پڑی تھی راستہ ناموار تھا اور بار بار حید سونپنے لگتا تھا کہ کہیں کار الٹ ہی سہ جائے۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندر ہمراپھیل گیا۔ دفعہ نامید کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

”کیا بات ہے۔“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔

”تعقیب...!“

”کیا...؟“

”جی ہاں... جھاڑیوں میں... ابھی دور ہیڈلا نہیں چکیں تھیں... غالباً کوئی کار ہی ہے۔“

”مک... کون؟“ ناگ ہکلا کر رہا گیا۔

”تینوں قیدیوں نے اچھلنا شروع کر دیا تھا۔“

”ذرالان کی کنٹی سہلاؤ۔“ فریدی نے حید سے کہا۔

حید کے تین ہی گھونسوں نے انہیں خاموش کر دیا۔ گھونے کنپیوں پر مارے گئے تھے۔

”ان میں سے کوئی ہوش میں تو نہیں۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

حمد انبیں اچھی طرح ہلا کر دیکھنے کے بعد بولا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ اودہ روشنی پھر...
زب ہی معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی نے کار روک دی لیکن انہیں کیا۔ پھر وہ ناگ کو بازو سے پکڑ کر اتر گیا۔ حید اس کے پیچے تھا۔

وہ تینوں قریب کی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انبیں بچھے ایک کار دکھائی دی جو ان کی کار سے تھوڑے فاصلے پر رک گئی۔ فریدی اس کی ہیڈلا نہیں کی روشنی ان کی کار کے پچھلے حصے پر پڑ رہی تھی۔ حید نے ریوالر نکالا۔ ایک آدمی کار سے اتر کر بچھے کھڑا ہو گیا۔

”شش...!“ فریدی حید کا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ”اسے کار کے قریب آنے دو۔“

اس آدمی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ فریدی کی کار کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے بچھے کی طرف لے جانے لگا۔

”چلو بڑھو...!“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”کوئی خطرناک ارادہ۔ اس کے قریب ہی رہو۔“

وہ تینوں اس کی کار کے ساتھ ہی ساتھ بچھے کی طرف چلتے رہے۔ کار کافی پرانے ماذل کی اور کیا تھی۔ اس نے اس کا انہیں خاصا شور مچا رہا تھا۔ بھی وجہ تھی کہ فریدی نے جھاڑیوں کی لڑکڑاہٹ کی بھی پروادہ نہیں کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انہیں کے شور میں جھاڑیوں کی آوازیں اب جائیں گی۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ نظر کرنے کے بعد کار رک گئی اور انہیں بند ہو گیا۔

تلکیا اور سانے کا وہی عالم تھا۔

”آخر یہ کیا کرنے جا رہا ہے۔“ حید نے سر گوشی کی۔

”لکھتے جاؤ۔“ فریدی بولا۔

ناگ کا پہ رہا تھا۔

”اماں تم آدمی ہو یا بدی جھوں۔“ فریدی نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ریوالر کی نہ اسنے ہی رکھنا، ورنہ کہیں اپنے ہی گولی نہ مار لو۔“

پھر وہ حید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ضورت کے وقت فائز کرنے کی اجازت ہے۔“

وہ تینوں سینے کے بل ریغتے ہوئے جھاڑیوں سے نکلے۔ لیکن کار بالکل خالی تھا۔

”چلنے کا رکھ خبر لیں۔“ تاگر بولہ۔
”کار... شاید کار کے ٹکڑے بھی نہ ملیں۔ کیا تم روشنی نہیں دیکھ رہے ہو۔ آگ چاروں
طرف پھیل رہی ہے۔ بس اب بیہاں سے نکل چلو۔“

”مجھ میں اب چلنے کی بھی تاب نہیں۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔
”چلو تو آدمیری پینچھے پر۔“ فریدی نے کہا۔

فریدی نے اُسے پینچھے پر لاد لیا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی... تاگر کو یہ دیکھ کر جرت ہوئی کہ
فریدی اب بھی اتنی ہی آسانی سے دوڑ رہا تھا جتنی آسانی سے اب تک دوڑتا آیا تھا۔ تاگر کی سانس
بڑی طرح پھول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سانس ہی درست کرنے کا موقع مل جاتا۔

سرٹک پر پہنچ کر فریدی نے حمید کو اتار دیا۔ تاگر گر کر زمین پر ہانپتے گا۔
”میرا خیال ہے کہ مسٹر کیو کے گروہ میں تم سب سے کچھ تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔
”آگر... میں... میں.... آپ کے ساتھ... نہ ہوتا... تو... میرا ہارٹ فل
ہو جاتا۔“

”وہ کار کس کی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”سر کاری۔“ فریدی بولا۔ ”بھی جلدی کرو! کم از کم دس میل پیدل چلانا پڑے گا۔“
”کیا بے نی ہے۔“ حمید مضمحلہ سی بھی کے ساتھ بولا۔
”ہے تو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن آگر ایسے میں جنمیں کوئی لڑکی مل جائے تو۔“
”جنم میں گئی لڑکی۔“ حمید غرما کر بولا۔
”کیوں بھی تاگر۔“

”بھی... مجھے تو آپ مسٹر کیو سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔“

”وہ تینوں مفت میں مارے گئے۔“ حمید نے کہا۔

”بھی چلتے رہو۔“ فریدی سکار سکاتا ہوا بولا۔
”مجھے تو اب بھی یقین نہیں کہ میں زندہ ہوں۔“ تاگر خوف زدہ آواز میں بولا۔
”کیوں...؟“

”مسٹر کیو! ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جنمیں سمجھتا ہے کہ وہ پولیس کے ہاتھ لگ

”وہیں مار لیتے تو بہتر تھا۔“ حمید بڑا بولیا۔

فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک زور دار دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا اور ایسا معلوم ہوا جسے پورے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔

”بھاگو...!“ فریدی حمید کا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا۔

وہ تینوں تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

”آخر... بب... بات کیا ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔ ایک دھماکا اور ہوا۔

”شاید اس نے کار پر بم مارا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اب ادھر ادھر نصیب رہا ہے۔“

”م... مسٹر کیو...!“ تاگر نے رونی آواز میں پوچھا۔

پھر دھماکہ ہوا۔ کار کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”جھاڑیوں میں... گھسیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”بس بھاگتے رہو... ایسی حفاظت نہ کرنا۔ یہ بم غالباً ادھر ادھر کی جھاڑیوں ہی میں پیچے جا رہے ہیں۔“

”تب تو مارے ہی گئے۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”بیٹے! حمید خال! اس وقت اُس سے الجھناٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں اسکے پاس کتناے اور بم ہوں۔
کار کی ہیڈ لا نیٹس کا عکس سامنے کی جھاڑیوں کے اوپری حصے پر پڑ رہا تھا۔ کار شاید کسی پیچے
نشیب میں تھی۔ ایک دھماکہ کہیں قریب ہی ہوا اور تیز قسم کی روشنی کے ساتھ ہی انہوں
آنچ بھی محسوس کی۔ دوسرے ہی لمحے میں کار سر پر تھی۔ تینوں نے داہنی طرف کی جھاڑیوں نہ
چھلانگ لگادی۔ فریدی نے پلٹ کر کار پر فائر کیا۔ دوریوں اور اور چلے۔ لیکن کار تیزی سے گزر کی
وہ بھی تک فائر کئے جا رہے تھے۔

”چلو بس بھی کرو۔“ فریدی جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

کار کے انجن کی آواز کہیں دور سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی سنائے میں گھل مل کر

”بڑی چوت ہوئی۔“ حمید بولا۔

”اس کے علاوہ نہیں کہ اب پیدل چلتے چلتے کچور نکل جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”بھوں کا اٹاک ختم ہو گیا تھا۔“

جائیں گے۔

”مگر اتم کہتے ہو کہ کسی نے اسے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”بھی ہاں!“

”پھر اسے کس بات کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے ساتھیوں کو پولیس پکڑ بھی لے تو خود اس پر ہاتھ پڑنا ماحل ہے۔“

”وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کا نام ہی معلوم ہو سکے۔

”اوہ....!“ فریدی نے کہا اور پچھے سوچنے لگا۔ ”ٹھیک ہی تو ہے۔ اگر پولیس کو یہ معلوم ہو گی کہ کوئی مجرم سیکرٹ سروس والوں کی شیلی و نیک ٹرانسشن سروس استعمال کر رہا ہے تو اسے بند کر دے گی اور مسٹر کیوائیک بہت بڑی آسانی سے محروم ہو جائے گا۔“

”تب تو یار ناگر۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں مر ہی جانا چاہئے۔“

”مجھ... مجھ....“ تاگر چلتے چلتے رک گیا۔

”ہاں! تمہیں مر جانا چاہئے۔“

”لیکن....!“ وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں مسٹر کیو سے بجاوں گا۔ لہذا میں اسی وقت تمہیں دوبار پچاڑکا ہوں۔ لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔“

تاگر کے منہ سے اسی آوازیں نکلے لگیں جیسے اسے فرنجک ہو گئی ہو۔

”چپ رہو گاگس....!“ حمید اس کی پیش پر گھونسہ جھاڑ کر بولا۔

”میں مر جاؤں گا۔“ تاگر نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

”اچھا! تو لڑ و بانش کی بات ہو رہی تھی۔“ حمید نے بڑے بڑے دردی سے قہقہہ لگایا۔ ”ظاہر ہے کہ مارے جاؤ گے تو ضرور مر جاؤ گے۔“

”مجھے معاف کر دیجئے۔“ تاگر گھٹکھیا کر بولا۔

”ابھی نہیں! مر جاؤ گے تب۔“ حمید نے جھلا کر کہا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”واقعی تم بڑے ڈرپوک ہو۔“ فریدی اس کا شانہ ٹھپٹتا ہوا بولا۔ ”مجھے حرمت ہے کہ مسٹر جیسے ممتاز آدمی نے تمہیں کس طرح اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا اور مجھے تواب اس میں بھی شیرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کو د جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔“

ہے کہ تم نشیات کی ناجائز تجارت کرتے رہے ہو۔ ایسے لوگ بھی تھوڑے کیا کافی دلیر ہوتے ہیں۔“
تاگر کچھ نہ بولا۔

”خیر میں تمہیں خود نہیں ماروں گا۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تمہیں خود کشی کرنی پڑے گی۔“
”خود کشی۔“

”ہاں.... ظاہر ہے کہ مسٹر کیو نے تمہیں پہنچایز کر کے خود کشی ہی کے لئے بھیجا تھا اور اس نے تمہارے پیچھے کسی کو لگا بھی دیا تھا جس نے اسے اطلاع دی کہ تم مر نے سے بچالنے گے ہو۔“
”پھر....؟“

”پھر یہی کہ تمہیں خود کشی کرہی لئی چاہئے ورنہ مسٹر کیو کو بڑا دکھ ہو گا اور میں نہیں چاہتا کہ اس بے شہار ایتیم کا دل دکھ۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ تاگر خوفزدہ آواز میں نہسا۔

”ویسے! تم رہتے کہاں ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہمیں جانا کہاں ہے۔“ حمید نے جھلا کر پوچھا۔

”بکومت.... ہاں.... تم نے نہیں بتایا۔“

”پرنس لین میں۔“

”مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ پھر قدرے توقف سے پوچھا ”اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔“

”کوئی نہیں.... میں تمہارہ تھا ہوں۔“

”تب خود کشی کے لئے کھڑی مناسب رہے گا۔“

”نہیں! نہیں۔“ تاگر کامپتا ہوا بولا۔ ”میں بالکل ویسا ہی محسوس کر رہا ہوں.... دریا میں کوئنے سے قبل.... نہیں.... میں خود کشی نہیں کروں گا۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو۔“ حمید نے پوچھا۔

”بالکل یہی کہ مجھے خود کشی کر لیتی چاہئے۔ دریا میں کوئنے سے قبل بھی یہی ایک خیال میرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کو د جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا۔“

”اوہ! یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ حمید اپنی نعلیٰ موچھوں کو اینٹھا ہوا بولا۔ ”سول ہبتال سے ایک لاوارث مردہ لے کر اُس پر تمہارا میک اپ کر دیا گیا۔“
 ”لیکن.... مردے میں خون کہان سے آیا ہو گا۔“
 ”یاد تم ڈیوٹ ہو! اُرے بکرے کاخون۔ ویسے تم بھی کسی بکرے سے کم نہیں ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”اب تم خود کشی کی وجہ بھی پوچھو گے۔“
 ”بیفینا....!“

”تمہارے مشر کیوں کو مطمئن کرنے کے لئے درستہ وہ تمہیں پاہال میں بھی نہ چھوڑتا۔“
 ”کوئی اور وجہ۔“ تاگر نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو جھسے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“
 حمید تھوڑی دیر یک آسے غور سے دیکھا رہا پھر بولا۔
 ”مجھے اب بھی تم پر شہر ہے۔“
 ”سک بات کافی تاگر چوک کر بولا۔“

”بھی کہ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھس کے بجائے عقل تو تمیں بھری ہوئی ہے۔“ حمید نے کہا اور اشناز سے ایک دیٹر کو بلدا کر اس سے بولا۔

”ایک کام کرو گے.... اوہ اچھا.... تھیک! یہ سانتے اخیار کا دفتر یہ ٹالیہاں ایک مس بر شیدہ ہیں.... جانتے ہو گا۔“ تو یہ لفاظ احمد دے آئے کیا سمجھے؟
 حمید نے اس طرح اسے آنکھ ملدی جیسے اس لفاظ میں کوئی حقیقت خلا ہو۔
 تھوڑی یو اپنا انعام۔ اُس نے ایک دوپتہ اُس کے ہاتھ پر رک دیا۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔
 ”کیوں آتے۔“ تاگر اپنی ایک آنکھ دبا کر سکر دی۔

”تاگر....!“ حمید نے بندگی سے اسے گاہل کیا۔
 ”فرمائیے“
 ”تم نے کبھی عشق کیا ہے۔“
 ”سک سے۔“
 ”سکی سے۔“

”ہاں....!“ تاگر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مجھے زندگی کے ہر حصے میں دولت سے عشق رہا ہے۔“

”تم اپنے گھر میں خود کشی کر دے گے۔“ فریڈی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
 تاگر کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی تیج نکلی اور بیہو ش ہو کر گر پڑا۔

خفیہ پیغام

تیرے دن پر نسلیں کی کوئی نمبر گیرا رہ میں ناگر کی لاش پائی گئی۔ داہمی کپٹی پر گولی گلی۔ پولیس کو اس تیجے پر چینپا پڑا کہ وہ خود کشی کا کیس تھا۔ کیونکہ قریب پڑے ہوئے روی الور کے دستے پر مرنے والے ہی کے انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ کوئی کی تلاشی لینے پر کافی مقدار میں کوئین برآمد ہوئی اور پھر کچھ کاغذات بھی ملے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والا بڑے پیانے پر فرشتات کا ناجائز لین دین کرتا تھا۔

کوئی کے باہر کافی بھیڑ تھی جس میں اخباروں کے روپوزٹر بھی تھے۔ پولیس نے کسی کو بھی اندر نہیں جانے دیا۔ سر جنٹ حمید تھوڑی دیر یک آنکھوں کی چمگڑیاں ستارہا پر وہاں سے چل پڑا۔ اس کے چہرے پر گھنی موچھیں تھیں اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ۔ لباس شکاریوں جیسا پین رکھا تھا۔ اُس نے ایک ٹیکسی کی اور پھر روز نامہ نیو اسٹار کے دفتر کے قریب اتر گیا۔ دفتر کے سامنے والے ریستوران میں داخل ہو کر اُس نے اوہر اُدھر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے مسکرا کر اسے آنکھ ماری اور حمید تیز تیز قدم اخناٹا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا رہا؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”تمہاری خود کشی خاصی کامیاب رہی۔“ حمید بیٹھتا ہوا بولا۔

تاگر ہنسنے لگا۔ اس کے چہرے پر بھی فریڈی نے اپنی استادی دکھائی تھی۔ اتنا شاندار میک اپ تھا کہ خود تاگر ہی پہلے اچھبھے میں پڑ گیا تھا۔

”کافی بھیڑ ہو گی۔“ تاگر نے پوچھا۔

”کچھ مت پوچھو تمہاری شادی پر بھی اتنے آدمی اکٹھانے ہوتے۔“

”لیکن لاش کہاں ملی تھی۔“

”وہت...!“ حمید نے نہ اسامنہ بنا کر کہا۔ ”تم فلسفی معلوم ہوتے ہو... خیر تھیں کنوں نہیں پسند آئی تھی۔“

”دولت کسی ایک کنوں کی پابند نہیں ہوتی۔“ تاگر مسکرا کر بولا۔ ”مگر وہ دوسرا...“
میں اسے کبھی نہ بھلا سکوں گا۔“

”اوہو! بر سینیل تذکرہ... یہ تو بتاؤ کہ اس رات کیا مجھے پہچان کر بے وقوف بنایا گیا تھا۔“
”قطیعی...!“ تاگر سر ہلا کر بولا۔ ”کنوں تھیں پہچانتی تھی۔ اُس نے تو یہاں تک تباہیا تھی
وہ کیڈیاں مسٹر فریدی کی تھی۔ حمید صاحب! میرا خیال ہے کہ کنوں اس گروہ کے بہتر
دماغوں میں سے ہے اور اس جیشی کی تو اس سے روح فارہ ہتی ہے۔“

”ہے زوردار...!“ حمید نے اپنے پانچ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

”دنیا کی مکار ترین لڑکی کہہ لو۔“ تاگر بولا۔

”تحوڑی دیر خاموشی رہی پھر تاگر ہی بولا۔

”اب ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”ہدایات کا انتظار۔“

”مسٹر فریدی کہاں ہوں گے۔“

”خدادی جانے! تمہارے مسٹر کیوں کو بھی دانتوں پیسنے آجائے گا۔“

”میں بھی پچھے ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ تاگر پچھہ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا یہ کم حرمت اگیزت
کہ میں نے خود کشی بھی کر لی ہے اور زندہ بھی ہوں۔ میری بھگہ دراصل جیل خانہ میں ہوئی چاہتے
تھی۔ لیکن محلہ سراغ رسانی کے ایک آفیسر کے ساتھ بیٹھا غمیں مادر رہا ہوں۔“

”شش...!“ حمید نے اُسے خاموش رہنے کا اشتارہ کیا۔ اس کی نظریں دروازے کی رفت اخڑ
ہوئی تھیں جہاں کرامہ رپورٹ انور سا اور محلہ سراغ رسانی کا بوڑھا اپنے ایک آصف داخل ہو رہے تھے۔
انور ایک جوان سال خوبصورت، ذین مگر لاپرواہ آدمی تھا۔ ظاہر تواریک معمولی کرامہ رپورٹ
تھا۔ لیکن شہر میں ہونے والے جرام سے اس کا تھوڑا بہت تعلق ضرور ہوا کرتا تھا۔ لیکن
ہوشیار تھا کہ قانون کی گرفت میں آنے سے قتل ہی کوئی نیا قتنہ کھرا کر کے الگ ہو جاتا۔ محلہ
کے آفیسروں میں فریدی کیے علاوہ اور کسی پے نہیں دیتا تھا۔ فخریہ کہتا تھا کہ میں فریدی کا شاہ
انور اور رشیدہ کے کارنا موں کے لئے جلد نمبر 4 اور جلد نمبر 5 ملاحظہ فرمائیے۔

ہوں رشیدہ اس کی دوست تھی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور ایک ہی فلیٹ میں
رہتے تھے۔ رشیدہ کافی حسین مگر مغضبوط اعضاء کی لڑکی تھی۔ چال ڈھال میں نسوانیت کی بجائے
 واضح قسم کی مرداگی رکھتی تھی۔

انپیٹر آصف محلہ سراغ رسانی کے ان آفیسروں میں سے تھا جو عموماً دسرے کے کاندھے
پر کھکھ بندوق چلانے کے قائل تھے۔ اس پر جب بھی کوئی آفت آتی وہ انور کے پیچھے لگ جاتا۔
اس سے مدد کا طالب ہوتا، کبھی خوشامدیں کرتا اور کبھی دھونس دھڑلے سے کام نکالنے کی کوشش
کرتا۔ انور اسے عموماً ”بوز ہے میٹے“ کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ تینوں حمید اور تاگر کے قریب ہی ایک
خالی میز پر آبیٹھے۔

”انور آصف سے کہہ رہا تھا۔ ”چلو جلدی سے آرڈر پلیس کرو۔“

”تم ہمیشہ گردن ہی کامنے کی فکر میں رہتے ہو۔“ آصف نہ کر بولا۔ ”خیر... بواۓ۔“
اس نے ویٹر کو بلا کر تین آدمیوں کے لئے لنج کا آرڈر دیا۔

”ہوں... اب کہہ چلو۔“ انور رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرا یا۔

”ظاہر ہے کہ تم اس موقع پر نچلے نہ میٹھو گے۔“ آصف نے کہا۔ ”میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ
اگر مجھ سے مل کر کام کرو تو کیا حرج ہے؟“

”چلو منظور ہے۔ میں مرتبہ دم تک تم سے مل کر کام کر بنا رہوں گا۔ کام بھی تو بتاؤ۔“

”اُڑنے لگے آخر! میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“

”خیر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”آخر وہ رائق لعل... کس کی ہو سکتی ہے۔“ آصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”غیری ہی ہے۔“ انور نے سمجھ دی اور لاپرواہی سے کہا۔

”پھر وہی۔“ آصف بگڑ کر بولا اور رشیدہ ہنسنے لگی۔

جمید اور تاگر آس کر کیم کھانے میں مشغول تھے۔

”تمہارے استوار۔“ آصف تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تو نہ جانے کس چوہے کی بل میں
جا گھے ہیں۔“

”اور آخر میں یقیناً کسی ہاتھی کی سوٹھ پکڑے ہوئے برآمد ہوں گے۔“ انور بولا۔

"ہونہے...!" آصف نے برا سامنہ بنایا۔

و شیر نے کھانا میز پر لگادیا تھا۔

"بہر حال تم اطلاعات چاہتے ہو۔" انور نے کہا۔ "لہذا سب سے بڑی اطلاع یہ ہے کہ بھی تک میں تو خود ہی اندر ہیرے میں ہوں۔"

"میں اسے تعلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تم تو شاند اسے بھی تعلیم نہ کرو کہ بعض اوقات تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو دیے بر سیل تک رہ میرے پاس سگریٹ بھی نہیں ہیں۔"

"تم ڈاکو ہو۔" آصف بگڑ کر بولا۔ "میرے پاس زیادہ پیے نہیں ہیں۔"

"کیوں! کیا اب اس فیشن اسیل بوز ہی عورت سے کچھ نہیں ملتا جس نے مار بن روڑ پر جن خانہ کھول رکھا ہے۔"

آصف تھیر آمیز نظر وہی سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ بڑدا تھے ہوئے اس نے جب سے پرس کیا۔

انور نے ویٹر کو آنکھ کے اشارے سے بلا کر آہستہ سے کہا۔ "ائیشٹ ایکپر لیں کے دو ٹن۔" "دو نہیں ایک۔" آصف جملہ کر بولا۔

"اس عورت کے پاس ایک لڑکی بھی....!"

آصف نے انور کو جملہ نہ پورا کرنے دیا۔ دس کا ایک فوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تھا۔ ہوا جلدی سے بولا۔ "چلو بھاگ کر جاؤ دو ہی لانٹا۔"

پھر وہ تھیر آمیز نظر وہی سے انور کو گھومنے لگا۔ رشیدہ دوسری طرف من پھیر کر مسکاری تھی۔ "آج کل میں بڑی پریشانیوں میں جلا ہوں۔" انور سر جھکائے ہوئے بڑدا نے لگا۔ "قیامت!

تین ملہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔ لا غری والے نے تقاضوں کی بھرپور کر رکھی ہے۔ رشیدہ کا الگ قرض دار ہوں۔"

"یاد تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" آصف بے سی سے بولا۔

"صرف دوسروں پر مجھے بلور قرض دے دو۔" انور اسی طریقہ سر جھکائے ہوئے بولا۔ "پرانی لوگوں کو اکر دوں گا۔"

"میں کوئی قارون ہوں۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"خیر نہ دو۔" انور نے مخصوصیت سے کہا۔ "ویسے میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔" آصف بگڑ کر اٹھا۔

"یہ تو تم کچھ کہہ رہے ہو۔" انور نے ٹھنڈے پانی کا گلاس چڑھا کر پیٹ پر پا تھوڑے پھیرتے ہوئے کہا۔

سگریٹ آگئے اور ویٹر میز صاف کر کے چلا گیا۔ آصف انور کو بدستور گھورتا رہا۔

"تم خود کو نہ جانے کیا سمجھتے گے ہو۔" اُس نے کہا۔

"ایک ایسا یتیم جو قطفی ہے سہارا ہو۔" انور مسمی صورت بنا کر بولا۔

آصف کی جھلاہٹ اور بڑھ گئی اور وہ رشیدہ کی طرف ہڑ کر بولا۔

"تم بھی نہیں سمجھاتیں اسے ابھی یقین ہے کہ کسی دن بڑی مصیبت میں پھنس جائے گا۔"

"بھی کبھی سمجھا دیا کرو بھی۔" انور نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ نہ پڑی۔

آصف بل ادا کر کے اٹھنے لگا۔

"تو تم میری مدد نہیں کرو گے۔" انور نے کہا۔

"نہیں..... نہیں..... نہیں۔"

"خیراب اس عورت کی خیر نہیں.... اور جو کچھ بھی بیان وہ عدالت میں دے گی ظاہر ہے۔"

"تم مجھے یہیک میل کرنا چاہتے ہو۔"

"بھتی بھی طرح دیتا ہوں اتنا ہی تم سر پر چڑھتے ہو۔"

"خیر اگر میں سر پر چڑھا ہو تو تم توٹی ہوئی ہڈیوں اور لوٹھڑوں کا ذہیر ہوتے۔"

"آخڑ تم چاہتے کیا ہو۔" آصف ایک جھٹکے کے ساتھ بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم میری مدد کرو! میں تمہاری مدد کروں گا اور ساتھ تھی دعا کروں گا کہ خدا میر اور تمہارا

نیزاپار کر دے۔"

تم مجھ سے ایک جھے بھی نہیں لے سکتے۔"

"تمہاری بڑھی! میں زبردستی کا قائل نہیں۔" انور نے آہستہ سے کہا اور اس کے چہرے پر

فرشتوں کی سی مخصوصیت نظر آئے گی۔

"اچھا بچھے ہی میتے میں مجھ سے ڈھانی سو لے چکے ہو۔"

”اور کیا...؟“
 ”میرے لئے کچھ نہیں لکھا۔“
 ”نہیں.... بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر تم بھی جھوکے جاؤ۔“
 ”شاید یہ میرے لئے پہلا اتفاق ہے کہ شہر میں ہونے والے کسی جرم کے متعلق لا عالم ہوں۔“
 رشیدہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
 ”اوہ....!“ انور پر خیال انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی را کُل والا چکر ہے۔“
 یہ کہا۔ یہ سب کچھ نہیں لکھا۔“
 ”خط کس سے ملا۔“
 ”نہیں کے لیک ویٹر سے۔“
 ”ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فریدی صاحب کے ہاتھ کوئی کڑی آگئی ہے۔ اسی لئے ان پر حملہ
 بھی ہوا تھا۔“
 ”ہو سکتا ہے.... وہ ما نیک و فون والا معاملہ بھی معمولی نہیں تھا۔“
 ”اور شاید وہی حملہ کا باعث بھی تھا۔ فریدی صاحب کے اس اعکشاف نے اس عجیب و
 غریب اسلئے کو قریب قریب بیکارتی کر دیا۔“
 ”مر جنت حمید کا بھی کہیں پڑے نہیں۔“ رشیدہ بولی۔
 ”سامنہ نہیں ہو گا۔“
 ”اچھا تو اب وقت ہو رہا ہے.... میں چل۔“ رشیدہ کلائی کی گھری دیکھ کر احمدی ہوئی بولی۔
 ”کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔“ انور نے کہا۔ ”خجواہ پڑے لیتا۔“
 ”ایک پانی بھی نہیں.... میں نہیں دے سکتی۔“
 ”نہ جانے کیوں آج بہت حسین لگ رہی ہو۔“
 ”نہیں میں جشن ہوں۔“ رشیدہ نے منہ بننا کر کہا اور باہر نکل گئی۔
 انور اپنائی تیکھی سے ہونٹ سکوڑے ہوئے سیٹی بجائے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ بھی تو سوچو کہ تم نے چھپلے میئنے میں لو ہے کی چور بازاری کے سلسلے میں ذیز
 کمائے تھے۔“
 ”آہستہ بولو۔“ آصف ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”عجیب لغو آدمی ہو۔“
 ”بہر حال اگر تم نے ڈیڑھ ہزار میں سے ڈھانی سو نکال دیئے تو کون سا براہماں کیا۔“
 ”میں ایک پانی بھی نہ دوں گا۔“
 ”ماں گتا کون ہے تم سے۔“ ازور بھی بگڑ کر بولا۔ ”میں براہ راست اسی سے معاملہ طے کر لوں گا۔“
 ”لیا...!“ آصف اچھل کر بولا۔ ”تم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔“
 ”بات!“ انور سمجھی گی سے بولا۔ ”میں اسے فلمی گیت تک سناؤں گا۔“
 ”خیر دیکھ لوں گا۔“
 ”تمہاری آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ چشمہ لگا کر دیکھنا۔“
 ”اچھا...!“ آصف دانت پیتا ہوا بولا۔ ”ویکھا جائے گا۔“
 ”وہ تیزی سے ریسٹوران سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہی ناگر اور حمید بھی اٹھ گئے۔
 رشیدہ انور کو مسکراتی ہوئی نظریوں سے دیکھ رہی تھی۔
 ”تم کسی دن ضرور چھنسو گے۔“ اس نے کہا۔
 ”ٹکار نکل گیا۔“ انور ہاتھ ملتا ہوا بولا۔
 ”ہر مہینے تلو ملتے ہو! غریب کو۔“
 ”غریب کہتی ہو۔ اس لکھ پتی کو اس نے برا راشی شاید پورے محکے میں کوئی نہ ہو۔“
 ”حالت تو چہاروں جیسی بیانے رکھتا ہے۔“
 ”توابی کر کے گردن تھوڑا ہی کٹوائے گا۔“ انور بولا۔
 ”اے بھی اے بھی فریدی صاحب کا خط ملا۔“ رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔
 ”کیا لکھا ہے؟“
 ”جیس ایندھ جعفری کی فرم کے لئے ایک لینڈی اشیونا پس کی جگہ نکلی ہے! آج ہی ان
 فریدی صاحب نے لکھا ہے کہ میں اندر ویو میں جاؤں۔“
 ”تو گویا.... وہ چاہتے ہیں کہ تم اس فرم میں ملازمت کرو۔“

ڈراؤنا آدمی

”آہم...!“ اس نے غرما کر سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
رشیدہ بیٹھ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا حلن خلک ہونے لگا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جنم
ہارشیدہ کا پر رہا ہو۔

”آہم... نام...!“ وہ غرایا۔

”رشیدہ...!“ وہ سر جھکائے ہوئے ہوئی۔

”تعلیم...!“

”بچپن آف آرٹس۔“

”نہ نہیں، گر بجوبیت کہو... لڑکی بھی بچپن... اپسرو۔“

”گر بجوبیت...!“ رشیدہ ٹھپر اکر بولی۔

”لپ اسک کبھی نہیں استعمال کرتیں یا آج ہی نہیں کی۔“

”کبھی نہیں۔“

”گلڈ...!“

پھر اس نے اپنی سیکریٹری کی طرف مز کر پوچھا۔ ”کوئی اور بھی ایسی ہے جس نے لپ اسک
بھی نہیں۔“ سیکریٹری کی کپکپائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

”سب کو رخصت کر دو۔“ وہ غرایا۔ ”اور اگر تم نے بھی اس کا استعمال ترک نہ کیا تو تمہیں
کھر رخصت کر دیا جائے گا۔... سمجھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی اور باہر چلی گئی۔

”وو کٹش...!“ اس نے رشیدہ کی طرف کاغذ اور پنسل سر کاتے ہوئے کہا۔
رشیدہ کا ہاتھ کا نپ رہا تھا لیکن وہ پنسل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

تحوڑی دیر بعد وہ بول رہا تھا اور رشیدہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی سر
الٹا کر اس کی طرف دیکھنے کی نہت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار بھی اس سے نظریں چار
ہو گئیں تو وہ جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے بیکار ہو جائے گی۔

”بن...!“ وہ تحوڑی دیر بعد بولا۔ ”جاوے سے ناپ کرو۔“

جیسیں ایڈ جعفری کا دفتر رحمٰن لاج کے تین چار لفڑیوں پر مشتمل تھا۔ شہر کی بڑی فرمومیں میں
جیسیں ایڈ جعفری کا بھی شمار ہوتا تھا۔ فرم کا ایک پارٹر جعفری عی اس کا جزل نجیب بھی تو
دوسرے ہے دار غیر ملکی تھے۔ جیسیں سب سے بڑا حصہ دار اور بالائیت کا باشندہ تھا لیکن وہ بھی یہاں نہیں
رہتا تھا۔ اس کی یہاں کی تجارت کی دلکشی بھاں اس کا مختار مسٹر ہر شفیلڈ کرتا تھا۔ وہ بھی ہر ماہ کے
اختام ہی پر دفتر میں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ فرم حقیقتاً جعفری عی کی کالا کردگی کی بناء پر چل رہی تھی۔
جعفری کے کرنے کے سامنے ایک بڑا کمرہ تھا جس میں اس کی سیکریٹری راحیلہ بیٹھتی تھی اور
شاید بھی کمرہ ملاقاتیوں کے لئے بھی تھا۔ حالانکہ انٹر دیو کا وقت دو بجے تھا لیکن فویں بجے سے
امیدوار آنے لگی تھیں۔ دو بجے تھے تو خاصی بھیڑ ہو گئی۔ ان میں سبھی نوجوان اور قبول صورت
تھیں۔ جو نہیں بھی تھیں انہوں نے بنیت کی کوشش کی تھی۔ انہیں میں رشیدہ بھی نظر آری
تھی۔ ابھی تک اس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ انٹر دیو کے لئے اندر جانے سے پہلے ہر لڑکی اپنے پر
سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے بالوں اور چہرے پر تنقیدی نظریں ضرور دلتی تھیں۔ بعض اور
ہونوں پر لپ اسک کی نتی تھے چڑھانے لگتیں۔ رشیدہ نے اپنے پس ٹھوٹا لیکن اس میں کیا تھا اور
اسے ایک سکھاںک تور کئے تھیں دیتا تھا۔ لپ اسک تو خیر اس نے رسول سے نہیں استحقا
تھی۔ اور کا قول تھا کہ لپ اسک لگانے سے حسن کی عصمت دری ہو جاتی ہے اور چہرے
فاہش پن پٹکنے لگتا ہے۔ البتہ ہلکے سے پاؤڑا اور اتنے ہلکے سے روچ پر کہ سرخی قدر تی معلوم
اے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ابھی کئی لڑکیاں باقی تھیں کہ سیکریٹری نے اگر رشیدہ کا ہام لایا۔
رشیدہ لاپڑاہی سے اٹھی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ سیکریٹری نے دروازہ کھولا اور رشیدہ
جزل نجیب منہ جعفری کے کرے میں داخل ہوئی۔
دوسرے خ اور خوفناک آنکھیں اس کی طرف اٹھیں اور رشیدہ کا نپ گئی۔ بھاری جزوں
چکھے خدا خال کا ایک ڈراؤنا آدمی اُسے گھور رہا تھا اس کے شانے کافی چوڑے اور بھرے۔
تھے۔ پیشانی اوچی اور بال مگریا لے تھے لیکن نہ جانے کیوں ان میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔

”گز!“ اس نے گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ ”ایک بات اور... تم اپنے کام سے کام رکھو گی۔ وہ بات جس سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہوا پسی دچکپیوں کی لست پر نہیں لاؤ گی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”آہم.... کچھ نہیں.... میں۔“ اس نے گھنٹی بجائی اور سیکریٹری پھر اندر آگئی۔

”آنہیں کام بتاؤ۔“ اس نے ایک کاغذ پر نظریں جھائے ہوئے کہا۔ سیکریٹری رشیدہ کو لے کر بڑے کرے میں چل آئی۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور ہاں کے نتھے سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے ایک فائل نکال کر رشیدہ کے سامنے ڈال دیا۔

”تاریخ و امار تائب کرتی جاؤ۔ ایک ایک نقل بھی ہو گی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ رشیدہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ویسے وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ فائل سے کاغذات نکال کر تائب کرنے پڑی گئی۔

تو گیا۔ رشیدہ اپنے کرے سے نکل کر اُن کی طرف دھیان دیئے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کے جو توں کی چڑچڑاہٹ کافی دیر تک سنائی دیتی ہی۔

رشیدہ تائب کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی عجیب و غریب آدمی میں الجھا ہوا تھا اور اس کی سیکریٹری راحیلہ تو اس سے بھی عجیب تر معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ایک دلیل پلی سی کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ آنکھیں بڑی اور پلکیں گھنیری تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی انجانے نئے سے بو جھل رہتی ہوں۔ رشیدہ نے اسے آفس میں روئے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اگر اپنے مالک کا رویہ اپنے لئے تو ہیں آمیز سمجھتی ہے تو یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے جعفری جیسا وحشی میں آج تک اس کی نظروں سے نہیں گزر اتھا۔ اس نے اس غریب لڑکی سے کتنی بے دردی سے باتیں کی تھیں۔ شاید وہ عورت کا احترام کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔

رشیدہ سوچتی رہی اور اس کی انگلیاں تیزی سے Key Board پر چلتی رہیں۔ اس نے یہ نکل کر محسوس کیا کہ راحیلہ اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گئی ہے۔

”میں تمہیں کہیں اور ملازمت نہ ملتی۔“ اس نے رشیدہ کو فاطب کیا اور رشیدہ چوک پڑی۔ ”ملازمت کہاں ملتی ہے آج کل۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

رشیدہ کرے سے چلی آئی۔ بڑے کرے میں سیکریٹری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے میز پر سر اونڈھائے بیٹھی تھی اور اس کے جسم کی متواتر جنبشوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ”سک سک کر رہا رہی ہے۔ رشیدہ چپ چاپ بیٹھ کر تائب کرنے لگی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ فریدی نے کہاں پھنسا دیا۔

تو گیا۔ رشیدہ میں ہمیں بھی اور سیکریٹری اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے آنکھیں خشک کیں لباس درست کیا اور اندر چلی گئی۔ رشیدہ نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے ہوند صاف کر دیا ہے۔

رشیدہ تائب کر کچنے کے بعد انتظار کرتی رہی۔ سیکریٹری اندر تھی۔ اس نے گھری کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اتنی دیر تک مٹول کر تائب کر کرتی رہی ہے لیکن اس کی بھی بہت نہیں تھی کہ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھلکھلاتی۔

جیسے ہی سیکریٹری کرے سے نکلی وہ گھری ہو گئی۔

”ہو گیا۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔ سیکریٹری نے سر کو خفیہ سی جنبش سے دروازے دے طرف اشارہ کیا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔

رشیدہ اندر چلی گئی۔

”آہم.... سٹ ڈاؤن۔“ جعفری غریباً۔

رشیدہ نے بیٹھنے ہوئے شیٹ اس کی طرف بڑھادی۔

”ٹھیک! پہلے کہاں کام کیا ہے۔“

”نیا شاٹ کے دفتر میں۔“

”وہاں سے کیوں چھوڑا۔“

”راکٹ شاٹ میں تھی۔“

”آہم! کتنی تجوہ تھی۔“

”ڈھائی سو۔“

”لیکن یہاں صرف دو سو میں گے۔“

”محضے منظور ہے۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

لاشوں کا آبشار

انگلیاں Key Board پر دوڑنے لگیں راحیلہ گھبر اہٹ میں ایک فائل الٹ رہی تھی۔ جو توں کی چڑچڑاہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر کمرہ گو بنجئے لگا۔ جعفری دونوں کی میزوں کے درمیان آئر رک گیا۔ دونوں اس طرح کام میں مشغول نظر آرہی تھیں جیسے انہیں اس کے آنے کی اطاعت ہی نہ ہو۔ البتہ راحیلہ کانپ رہی تھی۔

”آہم....!“ جعفری غریا۔ ”غمین لورہی تھیں.... لڑکی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔ ”تم نی ہو.... لیکن.... آفس نامم میں.... صرف کام ہونا چاہئے۔“

واپسے کمرے میں چلا گیا۔ رشیدہ بد خواہی سے ناکپ کرتی رہی۔ اس کے چلے جانے کے بعد، بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آذاب تک اس کے سر میں دھمک پیدا کر رہی تھی اور راحیلہ تو بالکل چیلی پر گئی تھی۔

چار بجے پوری عمارت گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ رشیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راحیلہ فائل اٹھا کر الماری بند کر رہی تھی۔ شاید یہ کام ختم ہونے کی گھنٹی تھی۔ رشیدہ بدستور ناکپ کرتی رہی۔

”مشین بند کرو۔“ راحیلہ نے اس کے قریب آکر کہا۔

”یہ شیٹ تو نکال لوں۔“ رشیدہ بولی۔

”نہیں گھنٹی بنجئے کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”خیر اگر تم کچھ اور بھی سننا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے منہ بنا کر کہا اور اپنا بینڈ بگ اٹھانے لگی۔

”ٹھہر و۔“ رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے جلدی جلدی شیٹ ناکپ رائٹر سے نکالا اور ”درے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھ دیئے۔

پھر وہ دونوں آفس سے نکل آئیں۔

”تو ہم گھرے دوست ہیں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”آؤ چائے بیس۔“

”چائے۔“ راحیلہ کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”مجھے فوراً ہی گھر پہنچنا ہوتا ہے.... مان انڈھی ہے نا۔ دوسرا بھیں بھی چھوئی ہیں۔ اگر میں تھوڑا بہت وقت تفریحات کے لئے وقف کروں تو.... مجھے دراصل یہاں سے جا کر کھانا تیار کرنا ہو گا۔“

”دو ہی تین ہفتوں میں تمہارے گالوں کی بہیاں اُبھر آئیں گی۔“

”کیوں....!“

”اوہ! کیا تم نے کچھ نہیں محسوس کیا۔“ وہ بذریعی انداز میں بولی۔ ”کیا وہ آدمی ہے درندہ.... وحشی....!“

”لیکن.... یہی میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر تم....!“

”میں....!“ وہ رشیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں مجبور ہوں۔ میری ایک اندر ہی بیوہ ماں ہے چھ بھائی بہن ہیں۔ وہ سب چھوٹے ہیں۔ اگر میں یہاں ملازمت ترک کر دوں تو ان کا کیا ہو گا۔ مجھے یہاں تین سوروں پے ملتے ہیں۔ زہر کی تین سو بوندیں، تین سو خیبر، جو چاہو سمجھ لو۔“

”یہ ہمیشہ ایسا ہی رہتا ہے۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”ہمیشہ.... تم ہر وقت یہی محسوس کرو گی کہ تم پر اپک سانپ پھن اٹھائے مسلط ہے معلوم نہیں کب ڈس لے۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”ڈیڑھ سال سے.... اور یہ ڈیڑھ سال ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ڈیڑھ ہزار برس گذر گئے ہوں۔“

”اس فرم کی خاص تجارت کیا ہے۔“

”ٹو ہے کاسالان، سمندر پار کی ادویات، پچھرہ اور بھی کچھ ایسی چیزیں جن کیلئے خاص اضاف ہے۔“

”بزرگی کی قیام کہاں ہے۔“

”خدا ہی جانے۔“

”کیوں؟“ رشیدہ کے لجھ میں حیرت تھی۔

”وہ ایک قطعی غیر سو شش آدمی ہے۔ کم از کم میں تو قطعی نہیں جانتی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور اس کی کیا مشغولیات ہیں۔“

”بیوی بچے ہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”بیوی بچے ہیں۔“ راحیلہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ ”جانوروں کے بیوی بچے نہیں ہو اکرتے۔“ دو رکھیں جو توں کی چڑچڑاہٹ سنائی دی اور راحیلہ اچھل کر اپنی میز پر جا بیٹھی۔ رشیدہ د

شوفر کو گریبان سے کپڑا کر نیچے کھینچ لیا۔ اس نے ان دونوں کی طرف دھیان تک نہ دیا تھا۔
ڈرائیور کو دو تین ہاتھ جھاڑنے کے بعد وہ نہایت سکون سے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور کار پل پڑی۔

ڈرائیور کئی منٹ تک گالیاں بکار رہا۔ نیکسی کے گرد اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔
”کیوں صاحب میری غلطی تھی۔“ وہ نیکسی میں بیٹھتا ہوا ان دونوں کی طرف مڑک رہا۔
”نہیں....!“ رشیدہ نے آہستہ سے کہا۔

”خیر سالے کو پھر بھی دیکھ لوں گا۔ اُسے بھی بھیں رہنا ہے اور مجھے بھی۔“
نیکسی رو انہے ہو گئی مگر ڈرائیور بدستور بڑبوائے جا رہا تھا وہ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے
شہر میں جتنے بھی قتل ہوتے ہیں اسی کے دم سے اور جتنی بھی بدمعاشیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب
کاروچ رواں وہی ہے۔ دنیا میں اب تک جتنے بھی سرکش گزرے ہیں انہیں اسی نے نیچا دکھلایا تھا۔
رشیدہ اور راحیلہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہی تھیں۔

حیدر کی شرارت

تقریباً آٹھ بجے رشیدہ راحیلہ کے گھر سے واپس آئی۔ راحیلہ کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا
کہ وہ ایک سعادت مند بیٹی اور محنت کرنے والی بہن ہے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی گھریلو
زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر کافی دیر تک لف اندوز ہوتی مگر اس کا ذہن تو اپنی فرم کے جزل۔
مثیر جعفری میں الجھ کر رہا گیا تھا۔ اگر انپکڑ فریدی نے اسے نہ بھیجا ہوتا تب بھی اور کسی موقع پر
اس کی شخصیت رشیدہ کے ذہن پر ایک بہت بڑا سوالہ نشان ضرور پیدا کرتی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ آخر اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے گی کیا وہاں کوئی
ایسا کام بھی ہوتا تھا جو کسی دوسرے کی کھوچی طبیعت میں بے چیزی پیدا کر سکتا ہو۔

وہ فٹ پاتھ پر پیدل چل رہی تھی۔ وفعاً اس کے قریب سے گذرتے ہوئے دو آدمیوں نے
اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وہ دبی زبان سے اسی عجیب و غریب را کل کا تذکرہ کر رہے
تھے جس نے پر اسرار طریقے پر وزیر خزانہ کو موت کے گھاث اتار دیا تھا۔ انداز گھنگو ایسا تھا جیسے

”تو پھر مجھے اپنا گھر ہی دکھادو۔“

”اوہ بڑی خوشی سے۔“ راخیلہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”ضرور چلو، ماں بہت خوش ہو گی یہ
کوئی دوست نہیں، مجھ چیزی مردہ دل سے کون دوستی کرے گا۔ آج کل دوستیاں تو عموماً کلبوں،
باروں اور یہود انوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اوہ.....ابھی تک بس نہیں آئی۔“

”نیکسی سے چلیں گے۔“ رشیدہ نے لاپرواٹی سے کہا۔

”نیکسی....!“ راحیلہ نے اس طرح دہرایا جیسے رشیدہ نے ہوائی جہاز کہا ہو۔

”ہاں....ہاں....میرے پاس کافی پیے ہیں۔ میں اکیلی ہی ہوں نا۔۔۔ کافی پیے بچتے ہیں۔“

”تم اکیلی ہو۔“ راحیلہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

رشیدہ نے ایک نیکسی رکوانی اور دونوں اس میں بیٹھ گئیں۔ پھر اس نے راحیلہ سے پتہ پوچھ
کر شوفر کو بتایا اور نیکسی چل پڑی۔ راحیلہ اب تک رشیدہ کو حیثت سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا کوئی مرد دوست نہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”نہیں کوئی نہیں۔“ راحیلہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”میں نے آج تک اس کی ہمت ہی نہیں کی۔“

”کیوں؟“

”میں اپنی ہی ذات سے بڑی خائن رہتی ہوں کہ میرے ہی جذبات مجھے شنکے کی طرح نہ
جانے کدھر بہالے جائیں گے پھر میری اندر ہمیں ماں کا کیا بنے گا۔ میرے نئے نئے بھائی بہن۔“

راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو چھکلت آئے تھے جنہیں وہ دوسری طرف منہ پھیر کر پینے کے
کوشش کر رہی تھی۔

رشیدہ کچھ نہ بولی اور اس لڑکی کی بیچارگی پر غور کر رہی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

دفعہ اریلہ تیج پڑی.... وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔

نیکسی کے ڈرائیور کی لاپرواٹی تھی یا سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھے ہوئے آدمی کی غلطی
کہ دونوں کاریں بس ایک فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ بریکوں کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں الگ
شیٹ کی پشت سے نکلا گئیں۔

دوسرے لمحے میں انہوں نے غراہٹ قسم کی آواز سنی جو جزل مثیر جعفری کی آواز کے
علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار سے اتر کر سیندھا نیمنی کی طرف آیا کھڑکی کھوئی۔“

وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں اور ان آدمیوں سے بھی واقف ہوں جنہوں نے اسے استفسر کیا تھا۔

رشیدہ چپ چاپ ان کا تعاقب کرنے لگی کیونکہ وہ ان کی حقیقت سے ناواقف تھی۔ ان میں ایک سرجنٹ حمید تھا اور دوسرا ناگر، حمید نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ وہ بھی تسلیک شکاری ہی دالے بھیں میں تھا اور اس کے چہرے پر گھنی موچھیں تھیں۔ رشیدہ کو دیکھ کر اس کی رُگ شرارات پھر زک اٹھی تھی اور اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رانفل کا تذکر چھیڑا۔ ان بھر کی کوفت کے بعد وہ تھوڑی سی تفریح بھی کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ اور ناگر میں فون ایکچھیں کے گرد منڈلاتے رہے تھے۔ میلی فون ایکچھیں میں ابھی دن محمد سراج رسانی کے دو تین آدمی بھیثیت میلی فون آپریٹر زداخی ہوئے تھے۔ انہیں فریدی کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ مسٹر کیو کے پیغامات پر نظر رکھیں اور انہیں نوٹ کر کے اس تسلیک پہنچائیں۔ حمید دن بھر کی روپورٹ لے کر جاہی رہا تھا کہ رشیدہ نظر آگئی۔

حمدی اور ناگر نے ایک ریستوران کا رخ کیا۔ رشیدہ بچھے گئی رہی وہ ان کے قریب ہی کی ایک خالی میز پر جا پیٹھی۔ حمید اور ناگر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ بظاہر وہ رشیدہ کی طرف سے لامع نظر آرہے تھے۔

رشیدہ نے کافی منگوائی لیکن اسے پیچے نہیں کہ کب ختم ہو گئی۔ وہ دراصل ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنی چائے ختم کرنے کے بعد حمید اور ناگر اٹھ گئے۔ رشیدہ کا شہبہ یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ دونوں فٹ پاتاخڑ پر آہستہ چل رہے تھے۔ سڑک سے گزر کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے۔ رشیدہ کافی فاصلے پر ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی تھی دریچ گلوں سے اسے گذرنا پڑا۔ وہ دونوں کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

وہ پھر ایک تاریک گلی میں ہڑے اور رشیدہ جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوئی اس نے محسوس کیا کہ دونوں کے قدموں کی آوازیں آئیں بند ہو گئی ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں میں گھوڑ رہی تھی۔ دفعتاً کوئی محدثی سی چیز اس کی کپٹی سے آگئی۔

”خبردار۔“ ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”آواز نکلی اور کھوپڑی صاف۔ بغیر آواز کا ریو اول۔“

”ہے... آگے چلو... چلو...!“

اب ریو اور کی تال اس کی پیٹھ پر تھی اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔

”وابہنے مژو... چلتی رہو... ٹھیک... اب رک جاؤ۔“

تالے میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی دی اور کوئی دروازہ چڑھاہٹ کے ساتھ کھلا۔ گلی میں عیوب طرح کی میلی سی بدبو گون خرہی تھی۔

”پلو اندر چلو... شاباش۔“ سرگوشی پھر سنائی دی۔ حمید حتی الامکان اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدہ پر لے سرے کی چالاک اور ذہین ہے اگر پہچان گئی تو ساری تفریح کر کری ہو جائے گی۔ ان کے پیچے دروازہ بند ہو گیا۔ پھر سونگ اون کرنے کی آواز آئی اور رہداری روشن ہو گئی۔ رشیدہ نے خود کو انہیں دونوں کے درمیان میں پایا۔ گھنی موچھ وائلے ٹھکاری کے ہاتھ میں ریو اور تھا۔

”آگے بڑھے... مختصر مدد۔“ سرجنٹ حمید نے نہایت ادب سے کہا۔

”اس کا مطلب...؟“ رشیدہ گھوڑ کر بولی۔

”اندر لغت موجود ہے۔ مجھے مطلب زبانی نہیں یاد رہا کرتے۔“

”مجھے جانے دو... ورنہ سورچاؤں گی۔“

”اوچی سے اوچی عورت سے بھی میں یہی توقع رکھتا ہوں۔“ حمید لاپرواٹی سے بولا۔ ”چلتے۔“ رشیدہ بے نبی سے چلنے لگی۔ وہ ایک کمرے میں آئے جہاں کی پرانی اور زنگ خورde کر سیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”تشریف رکھئے۔“ حمید نے ایک کری کی طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ بیٹھ گئی۔

”مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں۔“ حمید نے ذہن پر زور دینے کی ایکٹک کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا یہودگی ہے۔“ رشیدہ گھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جاوہ ایک چھراتلاش کرو۔“ حمید نے ناگر کو مخاطب کر کے کہا۔ ناگر مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”بیٹھئے بیٹھئے۔“ حمید رشیدہ کی طرف دیکھ کر خنک لبھ میں بولا۔ ”مجھے جو لڑکی پسند آتی ہے

طرح چیز چیز کر دیکھ لو کوئی جو مدد کو آئے۔ چلو تمہیں ان لڑکوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں دکھاؤں
بنہیں پہلے کھاچا ہوں۔ اے اب تو رال بھی پہنچنے گی۔ کہاں مر گیا۔ بھائی، اے کیا ابھی تک
چھراہی نہیں تیر ہوا۔ ”

”خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“

”سیاہ تم نہیں چاہتیں کہ میں تمہیں کھا جاؤں۔“

”نہیں....!“ رشیدہ بوکھلا کر بولی۔

”اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے یاد رکھو گی۔“

”ہاں....!“ رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا سن رہی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”رشیدہ....!“

”تب تو میں تمہیں ہر گز نہ چھوڑوں گا۔“

”کیوں....?“

”رشیدہ جو نام ہے تمہارا۔ ہر وہ نام مجھے بہت پیدا لگتا ہے جس میں شین ہو رشیدہ.... ہائے۔“

”وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ہاٹک لگائی۔“ ابے تیز ہو گیا چھرا۔

”تیز کر رہا ہوں۔“ کسی دوسرا سے کمرے سے آواز آئی۔

”جلدی کزو۔“

”نہیں.... نہیں....!“ رشیدہ گھصایا۔

”اے.... واھ.... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب سے پہلے تمہارے ہونٹ کاٹوں گا پھر

گالوں کا گوشت اتاروں گا.... ہائے ہائے۔“

”وہ کسی ندیدے آدمی کی طرح منہ چلانے لگا۔

”بچاؤ.... بچاؤ۔“ رشیدہ زور سے چینی۔

جمید ہنسنے لگا۔ دور کہیں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی

جلدی جلدی زینے طے کر رہا ہو۔

”چپ رہو.... چپ رہو۔“ جمید وہیرے سے بولا۔ ”میرا باپ آرہا ہے۔“

اے میں اپنی پہلی فرصت میں ذبح کر دالتا ہوں۔“

رشیدہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اس نے ذبح کر دالتا ہوں کہ وہ کسی اور کوئی نہ پسند آجائے۔“ جمید نے پھر کہا۔

”یکو نہیں! مجھے جانے دو۔“ رشیدہ جی کڑا کر کے بولی۔

”افسوس!“ جمید مغموم آواز میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم پہلی ہی نظر میں مجھ پر عائز ہو گئی ہو گی۔“

رشیدہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ کسی پاگل کے ہمچھے نہیں چڑھ گئی۔ اتنے میں ناگر ایک بڑا سا چھرا لے کر آگیا۔ جمید نے ہاتھ میں لے کر اس کی دھندر دیکھی پھر بگڑ کر بولا۔

”اس سے تو موم کی عورت بھی نہ ذبح ہو گی۔ جا کر تیز کرو۔“

ناگر چھرا لے کر پھر چلا گیا۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے۔“ جمید سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیٹھی عشقیہ انداز میں بولا۔ ”دل کبھی نیچے کبھی اوپر.... تمہارا خون کتنا لذیذ ہو گا۔ اور تمہاری بوٹیاں.... ہائے.... ہائے.... بغیر رشیدے کا گوشت.... ہو لے ہو لے احتیاط سے چباوں گا۔ بوٹیاں دانتوں کے نیچے پھسلیں گی.... ہائے.... ہائے۔“

وہ اچھل اچھل کر زور زور سے نیمنہ پیٹنے لگا۔

رشیدہ کا چونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انہیں الہارنے لگا۔

”ستی ہو۔“ جمید نے پھر ہاٹک لگائی۔ ”تمہاری انگلیوں کی ہڈیاں.... رسیلی ہڈیاں.... گزر گزر چباوں گا۔“

رشیدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر

یہ پاگل ہے تو ان کا ساتھی تو پاگل نہیں ہو سکتا۔ کس وہاں میں پھنس گئی۔

”ڈر نہیں بھئی۔“ جمید بچوں کی طرح ٹھک کر بولا۔ ”ڈر کر تم سارے مزہ کر کر اکر دو گی۔“

”مجھے جانے دو۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چینی۔

”اس مکان کی دیواریں خاص طور سے بنائی گئی ہیں۔“ وہ پر سکون لجھ میں بولا۔ ”تم اجی

"چھاؤ...!" رشیدہ پھر چھنی۔

"عجیب الحق لڑکی ہو۔ خدا غارت کرے تمہیں۔ سارا مزہ کر کر اکر دیا۔"

قدموں کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور رشیدہ کو اسکپل فریز دکھانی دیا۔ وہ چھ کر اس کی طرف چھٹی اور قریب قریب اس پر گر پڑی۔

"چھائے! چھائے مجھے اس پاگل سے۔"

"پاگل....!" فریدی کے لجھ میں حیرت تھی۔

"جی ہاں... پس پاگل... مجھے ذمکر کرنا چاہتا تھا... چھرا... چھرا... تیز ہو رہا ہے۔"

"سمجھا! نہہر و کھاں چلے۔" فریدی نے حمید کو لکارا۔

حمید رک گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔" فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔ رشیدہ سید ہی کھڑی ہو گئی تھی حیرت سے کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی فریدی کی طرف۔

"حمدی! میں تم سے حق حجج نہیں آگیا ہوں۔"

"حیدی....!" رشیدہ نے آہستہ سے دہر لیا اور اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ آہستہ آہستہ حید کی طرف بڑھی اور پھر اچھل کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے دوسرے لمحے میں وہ اسے ایک صوفے پر گرائے اس پر چڑھی بیٹھی گھونسوں اور چپڑوں کی بیداری کر رہی تھی۔ فریدی بے تھاش نہ رہا تھا اور حمید نہ تو وہ بھی رہا تھا لیکن رشیدہ کی چلکیوں اور بکوٹوں کی وجہ سے اس کی بندی میں کراہیں اور چینیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ بدقت تمام فریدی نے انہیں الگ کیا۔ اس دوران ناہر بھی آگیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک چھرا دبا ہوا تھا۔

"اُبھی تک میرا دل نہیں بھرا۔" رشیدہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"اور ابھی میری تحکم بھی دور نہیں ہوئی۔ انور واقعی براخوش قسمت ہے۔"

"بے حیا۔" رشیدہ نے بھنا کر کھا۔

"کسی عورت کے ہاتھ سے پٹنے میں بڑی لذت پائی جاتی ہے۔"

"اچھا تو نہہر و۔" رشیدہ پھر بڑھی لیکن فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حمید سے کہا۔ "اب شپیوں گا تمہیں۔"

"خدا کی صنم بڑی کوفت ہو گی مجھے۔" حمید ڈھٹائی سے بولا اور ہستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

"تم کیسے پھنس گئیں اس کے چکر میں۔" فریدی نے پوچھا۔
رشیدہ نے سارے واقعات دہرا دیئے۔

"عاجز ہوں اس سورے۔" فریدی نے کہا۔

"خیر میں بھی کسی موقعے سے وہ متھے چکھاؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔"

"بھی ابھی نہیں... بہت کام کرتا ہے۔"

"میں نے جیسے اینڈ جعفری میں ملازمت کر لی ہے۔"

"بہت خوب۔ جعفری کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ادھر ادھر بھی نظر رکھنا۔"

"میاں کا تعلق اسی رائق...!

"ہاں... ہاں... لیکن کسی کام میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ بڑا خوفناک اور پر لے سرے کا وحشی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" فریدی بیٹھا خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "تمہیں میری طرف سے براہ راست ملتی رہیں گے۔ جب ضرورت سمجھوں گا تو انور کو بھی شریک کرلوں گا ویسے اس کا خیال کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں اودہ کہتا ہے کہ ابھی تک میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔"

"معاملہ ہی ایسا ہے۔" فریدی نے سگار سلاکتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنا صحیح نام ہی بتایا تھلا۔"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے! میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم غلط نام نہ بتاؤ۔ اس طرح اسے شبہ ہو جاتا۔"

"تو کیا اس طرح شبہ نہ ہو گا۔" رشیدہ نے کہا۔ "شہر کے سارے جرام پیشہ قریب قریب میرے اور انور کے نام سے تواقف ہی ہیں۔"

"فکر مت کرو۔ تم وہاں اکیلی نہیں ہو۔" فریدی بولا۔ پھر اس نے حمید کو آواز دی۔

حمدید دانتوں میں پاپے دبائے ہوئے اس شان سے داخل ہوا جیسے کچھ دیر قبل اس نے کوئی

بہت بڑا منصر کہ سرانجام دیا ہو۔ رشیدہ کو بھی بھی آہی گئی۔

"رشیدہ کو گلی کے موڑ تک پہنچا اؤ۔" فریدی نے کہا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" رشیدہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

”ابسا بھی کیا۔“ حمید اس کے پیچھے چل پڑا۔ ناگر بھی اس کے ساتھ تھا۔ رشیدہ کو پہنچا کر دنوں لوٹے۔

فریدی کرنے میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ حمید کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ ”نہ موقع دیکھتے ہونہ محل! آخر سے بیہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ گدھے کہیں کے شرم نہیں آئی پہنچتے ہوئے۔“

”آپ کو آگئی... سیکی کافی ہے۔ میں اور آپ الگ تھوڑا ہی ہیں۔“ حمید جیب سے دن بھر کی روپورٹ نکالتا ہوا بولا۔ ”مسٹر کو کے نام کی پیغامات تھے۔ نمبر انہیں ملک نمبر ۲..... نہیں ملا۔..... بہر حال دن میں تقریباً پچاس آدمیوں نے ”نہیں ملا“ کی ہائک لگائی۔ سہوں نے پیک ٹیلی فون بو تھا استعمال کئے تھے۔ پیغام نمبر ۵۳۔ سب ٹھیک ہے۔ نمبر ۵۴..... دیکھ لیا جائے گا۔ نمبر ۵۵ انتظار ہو گیا۔ نمبر ۶..... آج رات کو۔ نمبر ۷..... بغلہ خالی ہے! کوئی یا غیر بھی تک نہیں رکھا گیا۔“

”آخری پیغام...!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ” غالباً ذاکرٹر نارنگ کے متعلق ہے۔“ اودہ ٹھیک بیاد آیا۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا۔“ حمید نے کہا۔ ”آج تین بجے شام کو کسی نے ذاکرٹر نارنگ پر بھی حملہ کیا تھا۔... حملہ آور پکڑا نہیں گیا۔“

”کہاں... کتن طرح۔“ فریدی چوک کر تجوہ میں بخیار میں رود پڑا۔ ”عجیب بازار میں... میں روڈ پر... وہ کار میں جا رہا تھا کہ کسی نے گولی چلائی لیکن وہ نجی گیا۔ شیش کے کچھ ٹکڑے اس کے جسم پر لگے ہیں۔“

”اوہ....!“ فریدی کی پیشانی پر شکنیں اُنہر آئی تھیں۔ ”رمیش! جیون اور اختر!“ حمید بولا۔ ”جیس ایڈ جعفری کے ذفتر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ د آخر انہیں وہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ کیا وہی مسٹر کیوں ہو سکتا ہے۔ جعفری ہے تو خوفناک۔ رشیدہ وہاں کیا کرے گی۔“

”دیکھتے جاؤ۔“ فریدی نے کہا اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

ڈکٹا فون

مسٹر کیوں کا مسئلہ بھی تک فریدی اور حمید ہی تک محدود تھا یا پھر خود اسی کے گروہ والے اس نام سے واقع تھے۔ رشیدہ تک کو فریدی نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کا محکمہ تو خیر انہیں میں تھا ہی۔ اس بدل بھی اس نے حسب عادت مجھے کوپنی مشغولیات کی باقاعدہ روپورٹ نہیں دی تھی۔ آئی۔ جی تک کو اس کا علم نہیں تھا کہ فریدی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ فریدی نے اپنے ماتحتوں میں سے پانچ چھ خاص قسم کے آدمیوں کو مختلف کاموں پر لگا کر تھا تھا لیکن ”بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ہدایات کہاں سے مل رہی ہیں۔“

بہر حال مسٹر کیوں کا نام تاریکی ہی میں رہتا اگر واقعات نے دوسری رانچ اختیار نہ کر لیا ہوتا اور شاید اس واقعے کا ذمہ دار بھی فریدی ہی تھا کہ مسٹر کیوں کو خود ہی اپنا نام ظاہر کر دینا پڑا۔ فریدی کو پہلے سے علم تھا کہ اس نام کو یکرٹ سروٹ کے بعض ممبر استعمال کرتے رہے ہیں۔ لہذا حمید اور ناگر کے تجربات سامنے رکھ کر اس نے اس کے متعلق تفتیش شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم اس سے واقع ہو گیا ہو اور اس نے اب کسی قسم کی پر وہ داری مناسب نہ سمجھی ہے۔

ناگر کی مصنوعی خود کشی والے دن کے بعد سے میں فون ایکچھ میں مسٹر کیوں کے نام کے پیغامات موصول ہونے بند ہو گئے تھے۔

جس دن ناگر کی مصنوعی خود کشی منظر عام پر آئی اسی دن ذاکرٹر نارنگ ایم۔ پی پر حملہ کیا گیا۔ لیکن وہ بال نجی گیا۔ اسی رات کو ایک دوسرا حادثہ ہوا۔ وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے معقول نہیں تھا۔ ذاکرٹر نارنگ ہی کے گروپ کے دو پارلیمنٹری ممبر اپنی قیام گاہوں پر قتل کر دیئے گئے۔ دوسری صبح کو ان کے سر جسموں سے الگ پائے گئے اور انتہائی کوششوں کے باوجود بھی اس قسم کے نشانات نہ مل سکے جن سے قاتلوں پر روشنی پڑتی۔

تو عوام میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی اور خواص کو توہر لحظہ ملک الموت کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے وزیر خزانہ انتہائی پر اسرار طریقے پر قتل ہوئے پھر ذاکرٹر نارنگ پر شہر کی سب سے بھرپوری پرست سڑک پر اعلانیہ حملہ کیا گیا اور اسی رات کو پارلیمنٹ کے دو اور ممبر قتل کر دیئے گئے لہذا خواص کی سراسری سیکھی لازمی تھی۔

”اور اب.... ایک ایسی بات ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر مضطربانہ اٹھا اور دروازے تک گیا۔ ایک لمحہ ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور لوٹ کر آہستہ ہے بولا۔ ”آج صحیح مجھے ایک دھمکی آمیز خط طلا ہے کسی نامعلوم آدمی کی طرف سے۔“ اس نے اپنے کوٹ کی اندر ونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف بڑھا دیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی اپنے سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ معمولی کاغذ پر تاپ کیا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایم پی.... خوش قسم تھے کہ کل نج گئے۔ بہر حال تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنا دبہ بگلہ ایک ماہ کے لئے بالکل خالی کر دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو زیر خزانہ اور تمہارے دوسرا ہیوں کا ہو چکا ہے۔ اگر تم اسے محض دھمکی سمجھو تو یہ تمہاری بھول ہو گی۔ اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینا واقعہ کی برپا دی کے علاوہ اور پچھے نہ ہو گا۔ وزیر خزانہ کی موت ہزاروں کے مجمع میں ہوئی تھی تمہارے دونوں ساتھی بھرے پرے گھروں مبارکہ لئے لیکن کسی کو کافی کان خبر نہ ہوئی۔ کافی عقل مند آدمی ہو۔ اس لئے توقع ہے کہ حکم کے خلاف نہ کرو گے۔ فقط

مسٹر کیو۔“

”مسٹر کیو!“ ڈی۔ آئی۔ جی آہستہ سے بڑا بیا اور جواب طلب نظر وہ سے ڈاکٹر نارنگ کی طرف دیکھنے لگا۔

”اب بتائیے میں کیا کروں۔“

”آپ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا مگر یہ مسٹر کیو۔“

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن کیا آپ کے حفاظتی اقدامات مجھے بچا سکتیں گے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کے چہرے پر گھرے نکل کے آثار تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو۔“

”مذاق! مجھ سے کون.... مذاق کرے گا۔ شاید آپ بھول رہے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ

مکملہ سراغ رسانی کی عمارت میں تو گویا زرلہ آگیا تھا۔ آئی۔ جی سے لے کر معمولی لباس والے تک بوکھلا ہٹوں کا شکار نظر آرہے تھے۔ سارا عملہ آج پھر بڑے کمرے میں اکٹھا تھا۔ البتہ فریدی اور حمید موجود نہ تھے اور وہ پانچ مخصوص سادہ لباس والے بھی نہیں تھے جنہیں فریدی نے خود ڈرینگ دی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اور آئی۔ جی میں کسی خاص مسئلے پر بحث ہو رہی تھی، ایک کلرک نے آرڈر کو مطلع کیا کہ اس کی فون کال ہے۔

ڈی۔ آئی۔ جی اٹھ کر چلا گیا تقریباً تین منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر ایک انپکٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایم پی کا فون تھا۔“ اس نے آئی۔ جی سے کہا۔ ”کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ آواز سے خوفزدہ معلوم ہوتے تھے۔“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ اب یہ سب اپنی حفاظت کیلئے آدمی بھی مالگیں گے۔“ آئی۔ جی بولا۔ ڈی۔ آئی۔ جی چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی شہری قیام گاہ کے کمرے میں بے چینی سے ٹھہل رہا تھا جیسے ہی ایک نوکرنے ڈی۔ آئی۔ جی کا ملا تھا کارڈ لا کر دیا وہ خود ہی صدر دروازے تک دوڑا چلا گیا۔

”اوہ.... آپ آگئے شکریہ۔“ وہ ڈی۔ آئی۔ جی سے مصافحہ کرتے ہوئے مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”چلے... اندر چلے... اوہ! میں اس تکلیف دہی کے لئے شرمند ہوں۔ میں خود بھی... آپ تک پہنچ سکتا تھا مگر....؟“

وہ اسے نشست کے کمرے میں لے آیا۔

”بیٹھئے! بیٹھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ ہو چکا ہے اور رات کو میرے دے ساتھی....!“ ڈاکٹر نارنگ تھوک نگل کر رہ گیا۔ پھر ہٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ وزیر خزانہ بھی میرے گھرے دوستوں میں سے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ میری.... ہم لوگوں کی پالیسی سے تو پورا ملک واقف ہے....!“

”جی ہاں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی سر ہلا کر بولا۔ ”یہی توباعث حرمت ہے ہمارے کے سارے مخلص اور بے ضر محبت وطن تھے۔“

آئی۔ جی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اردنی نے چق بٹا کر آپریشن روم کے انچارج کی آمد کی اطلاع دی۔

”بلاو...!“ آئی۔ جی بولا۔

آنے والے نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا۔ ”آپ کے نام ٹرانسیمیٹر پر یہ پیغام موصول ہوا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے کاغذ لے لیا۔ یہ پیغام مخفی اشاراتی الفاظ (Code Words) میں تھا۔ دفعہ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چک پیدا ہوئی اور وہ دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولا۔

”دیکھا آپ نے! ہمیں مسٹر کیو کے متعلق آج ہی معلوم ہوا ہے لیکن فریدی پہلے سے جانتا تھا۔“

”یعنی....؟“

”سنئے!“ ڈی۔ آئی۔ جی کاغذ پر نظریں جھائے ہوئے بولا۔ ”جب والا مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کیو نے خود ہی اپنے کو ظاہر کر دیا اور یہ بات بھی آپ سے پو شیدہ نہ ہو گی کہ یہ نام سیکرٹ سروس کے پانچ ممبر ان استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے پہلی بار مجرم مسٹر کیو کے نام سے آگاہی ہوئی تو میں بنے سیکرٹ سروس والوں کی تلاش شروع کر دی میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگالیا ہے۔ لیکن وہ خود نہیں ملے اور نہ ان کے ٹرانسیمیٹر ہی کا سراغ مل سکا۔ ٹیلی فون ایکچھی میں بھی پرسوں رات سے اب تک مسٹر کیو کے نام کوئی پیغام نہیں موصول ہوا۔ حالانکہ پچھلاری کارڈ تاتا ہے کہ ہر گھنٹے میں آٹھ دن پیغامات اس کے نام ضرور ہوتے تھے۔ آپ اس سلسلے میں سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے گفت و شنید کچھ۔ دیسے میں تو یہی کچھ پر مجبور ہوں کہ وہ پانچوں عرصہ ہوا ٹھکانے لگادیے گئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خاموش ہو کر فخر یہ انداز میں آئی۔ جی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہوں...!“ آئی۔ جی نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور اس طرح اپنے جو توں کی طرف دیکھنے لگا جیسے ان سے جواب طلب کر رہا ہو۔

”تو کوئی سیکرٹ سروس والوں کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“ آئی۔ جی تھوڑی دیر بعد بولا۔

بھی ہو چکا ہے۔“

”تو سنئے! میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ چپ چاپ بغلہ خالی کر دیجئے۔ کیا وہاں آپ سے ملازم میں ہیں؟“

”جی ہاں!“

”تو انہیں وہاں سے ہنادیجئے۔ بقیہ ہم دیکھ لیں گے اور آپ زیادہ تر گھر ہی رہیں تو ہتر ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا پھر وہ خط اس سے لے کر واپس آگیا۔

آئی۔ جی اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں اپنے مخصوص ریلائنز روم میں چلے آئے۔

ان دونوں کے درمیان مسٹر کیو کی شخصیت زیر بحث تھی۔

”جہاں تک میرے علم میں ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”یہ نام سیکرٹ سروس والے“

استعمال کرتے ہیں اور اس کا علم میرے محلے میں فریدی کو ہو تو ہو اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ

وہی ایک ایسا ہے جو متعلق اور غیر متعلق ہر بات پر نظر رکھتا ہے۔“

”لیکن سیکرٹ سروس والے....!“ آئی۔ جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اسی الگھن میں بڑی دیر سے بتلا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”آخر یہ فریدی روپرٹ کیوں نہیں دے رہا ہے۔“ آئی۔ جی کے لجھ میں جلاہٹ تھی۔

”کہی نہیں دیتا اور میرے خیال سے اچھا ہی کرتا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خصوصاً یہ معاملہ تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس میں انتہائی ازاد داری سے کام لیا جائے۔“

”میں اسے درست نہیں سمجھتا۔ روپرٹ تو اسے دینی ہی چاہئے۔“

”کون سمجھائے اُسے! زیادہ کہتے تو اس تعریفی تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مخفی فطری میلان کی بناء پر ملکے میں آیا ہے۔ ورنہ خاندانی دولت اتنی کیشر رکھتا ہے جو کئی پشتوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔“

”کچھ بھی ہواتی خود سری نہیں برداشت کی جاسکتی۔“ آئی۔ جی کی آواز غصے میں کانپ رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”وہ جب بھی اس طرح غائب ہوا ہے کچھ نہ کر کے ہی واپس آیا ہے۔ گارس اسی والے کیس کو لیجئے۔“

”آپ خواہ مخواہ اس کی طرف داری کر رہے ہیں۔“ آئی۔ جی بگڑ کر بولا۔

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا لیکن اس کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔“
”پھر کیا کیا جائے۔“

”میرے خیال سے سیکرٹ سروس والوں کے ہینڈ کوارٹر سے تحقیق ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپ اسی اندر داخل ہوا۔

”آپ پیش روم کے انچارج کو سلام دو۔“ آئی۔ جی نے کہا۔

”تھوڑی دیر بعد انچارج آگیا۔“

”یہ بیٹام...!“ آئی۔ جی کا غصہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا ”سیکرٹ سروس کے ہینڈ کوارٹر کے

لئے جواب فوراً چاہئے۔“

آپ پیش روم کے انچارج کے جانب کے فوراً بعد کمی منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی آئی جی بولا۔

”میرا خیال ہے کہ فریدی کسی سیدھے ہی راستے پر لگ گیا ہے۔“

”لیکن مجھے اس کا پرویہ قطعی پسند نہیں۔“ آئی۔ جی نے تنخیل جھیل میں کہا۔ ”ضروری نہیں

کہ وہ ہر معاملے میں داشت مند ہی ثابت ہو۔ اسے دوسروں سے بھی مشورہ کرنا چاہئے۔“

ڈی آئی۔ جی شاید بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔

”بات تو ٹھیک ہی ہے! اگر ہماری علمی میں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو ہمیں اطلاع مکنت ہو گی۔ خیر اگر مل گیا تو میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”سمجاو نہیں بلکہ مجبور کرو۔“

”ہبھر ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ دونوں کے چہرے گھرے تفرک کا پتہ دے رہے تھے۔ دفاتر

ڈی آئی۔ جی چوک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”یہ آواز کسی تھی۔“ وہ آہستہ آہستہ بڑھا لیا۔

”آواز کہاں...!“

”کچھ کھر کھر رہی تھی۔“

آئی۔ جی ہٹنے لگا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”واقعی ہم لوگوں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔

غالباً اس الماری میں کوئی چوبانہ ہے۔“

لاشوں کا آبشار

”پوہا! وہ دیکھئے! سنئے یہ آواز کچھ ایسی ہی ہے جیسی مائیکر و فون میں ہاتھ لگنے کی دوسری چیز کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔“

”آئی۔ جی غور سے سننے لگا پھر سر ہلا کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہے تو۔“

”آئی۔ جی نے الماری کھول کر دیکھا۔ وہاں کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن آواز تھوڑے تھوڑے وقتوں کے بعد برابر سنائی دیتی رہی۔ دفعتاً اس نے الماری کے پیچے جھانک کر دیکھا اور اس کے منہ سے ایک تحریر آئیزی آواز نکل گئی۔“

”ڈکٹافون سے...!“ وہ آئی۔ جی کی طرف بڑھ کر بولا۔ ”یہاں ڈکٹافون کا کیا کام۔“

دونوں خاموشی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آئی۔ جی نے آپ پیش روم کے انچارج کو پھر بولایا۔ لیکن اس نے بتایا کہ مجھے کے سارے ڈکٹافون آپ پیش روم ہی میں موجود ہیں اور اس کر کے میں تو بھی کوئی ڈکٹافون لایا ہی نہیں گیا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی ہماری گفتگو سنا رہا ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا۔

اس انکشاف پر مجھے کی عمارت کو ایک دوسرے زانوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سارے کمرے چھان مارنے لگے اور نتیجے کے طور پر پانچ عدد سوٹ اور بھی برآمد ہوئے۔

لیکن ان کا سلسلہ کہاں سے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک انکشاف نے اس کا بھی پتہ کالیا۔ میلی فوراً

کے تاروں پر لپٹے ہوئے باریک تار دکھائی دیئے جن کا سلسلہ دوسرے کھبے تک چاکر ختم ہو گیا تھا اور وہیں سے تار پیچے کی طرف لائے گئے تھے۔ دوسرا کھبہ دراصل مہندی کی ایک بے

ترتیب باڑھ کے بڑے میان میں تھا اور اس کی بے مرمت شاخیں کافی اونچائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے ان تاروں کا آسمانی سے دیکھ لیا جاتا تقریباً ممکن ہی سا تھا۔

پھر مہندی کی باڑھ سے ملی ہوئی مالتی کی جھاڑیوں میں ڈکٹافون کار سیوینگ سیٹ بھی مل گیا۔ اس کی علاش کے سلسلے میں کافی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور ڈی۔ آئی۔ جی سوچ رہا تھا کہ ان سے ایک

ہالیائی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔

”ہم سے غلطی ہوئی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”اب اس آدمی کا پتہ چنانہ شوار ہے جو انہیں استعمال کرتا ہے۔“

ایک آئے ساعت جو دوسروں کی لا علمی میں ان کی پوشیدہ گفتگو سننے کے لئے استعمال کیا ہے۔

”غلطی توچ بجھوئی۔“ آئی۔ جی مصلح آواز میں بولا۔
”اگر فریدی ہوتا...!“

آئی۔ جی کے حلق سے نکلنے والی غصیل آواز نے ڈی۔ آئی۔ جی کو جلد مکمل نہ کرنے دیا۔
”میا ہوتا۔“ آئی۔ جی چیخ جلا کر کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے اسے فوق البشر کا درجہ دے رکھا
ہے اور اسی لئے اس کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خون کے گھونٹ پی کر زہ گیا۔ اس نے تھیہ کر لیا کہ وہ اب پچھے بولے گا ہی نہیں۔
پچھے دیر بعد وہ پھر اسی کمرے میں آبیٹھے جہاں ڈکٹافون کا پہلا پیٹ ملا تھا۔ وہ دونوں خاموش
ہی تھے اور ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات پائے جا رہے تھے۔
آپریشن روم کے انجارج کے قدموں کی آہت نے خاموش کا ٹلسٹم توڑ دیا۔ وہ آئی۔ جی کے
سامنے ایک کاغذ رکھ کر واپس چلا گیا۔

یہ سکرٹ سروس کے ہدایہ کوارٹر والوں کی رپورٹ تھی جوڑا نسبت پر موصول ہوئی تھی۔
آئی۔ جی پڑھنے لگا۔

”یاد چھوں آدمی کام کر رہے ہیں۔“ تین دن قبل ان کی تجوہیں ادا کی گئی ہیں۔ ان کی جائے
رہائش کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ جب ضرورت محسوس ہوگی ان سے معلوم کر لی جائے
گی۔ لیکن اس کے لیے بھی اوپر سے آئے ہوئے احکامات ہی کار آمد ثابت ہو سکیں گے۔“

آئی۔ جی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر سر ہلا کر بولا۔
”عجیب بات ہے۔“

”ہے تو عجیب ہی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ اس
موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ حقیقت فریدی کے اس خیال سے متفق تھا کہ سکرٹ سروس والے
بھی اڑا لے گئے اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بیتلکی کی خفیہ نگرانی شروع کراوے۔

سعی لا حاصل

ایک دن رشیدہ بہت سویرے آفس پہنچ گئی۔ لیکن یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اس نے دیا

دانستہ اپسیا کیا تھا۔ تین چار دنوں کے دوران اس نے چیز ایڈیٹ جعفری فرم کے متعلق بہت کچھ
معلوم کر لیا تھا اور جعفری کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے بُوٹ کی تھی کہ وہ اکثر اپنے کمرے
میں بیٹھے ہی بیٹھے جیسے جیسے اگری طور پر غائب ہو جایا کرتا تھا۔ جعفری کے کمرے کا دروازہ اسی بڑتے
کمرے میں لختا تھا جس میں رشیدہ اور راحلہ بیٹھا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف صرف
کھڑکیاں تھیں اور ان میں بھی لوٹنے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ خیال ہوتا کہ وہ پاہر
جانے کے لئے ان کھڑکیوں ہی کو استعمال کرتا ہو گا۔ لہذا رشیدہ کا خیال تھا کہ اس کے کمرے میں
چور دروازہ ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے کاانا چاہتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ جعفری دس بجے سے
پہلے آپس میں نہیں آئے گا ورنہ شاید وہ اس کی بہت بھی نہ کرتی۔ کیونکہ محض اس کی آنکھوں ہی
سے اس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ آٹھنچھر ہے تھے ساڑھے نوبجے قبل قبیل بر اجلیہ کے آنے
کے پہلی امکانات نہیں تھے۔

صفائی کرنے والا کمرے کی صفائی کر کے جا پکتا تھا اور چپر اسی بڑتے کمرے کے پاہر اسٹول پر
بیٹھا بڑے مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ رشیدہ کو خلاف معمول اتنے سویرے دیکھ کر اسے جیسے
ہوئی لیکن رشیدہ نے پچھلے دن کے بقیے کام کو پنٹا نے کا پہنچا کر کے اس کی جیسے زیادہ نہ بڑھنے
دی۔ جالانکہ یہ چیز چیز ایڈیٹ جعفری کی فرم کے قاعدے کے خلاف تھی۔ لیکن چپر اسی شایدیہ
سوچ کر چپر ہورہا کہ مس صاحب ابھی بھی پھنسی ہیں۔ جس دن فتحر صاحب نے کان کھوی دیئے
ہے بھیک ہو جائے گا۔

رشیدہ فائیں نکال کر ناپ کرنے بیٹھ گئی لیکن چپر اسی کام سلبہ؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کس
طرح نالا جائے۔ دفتار اسے اس نے آواز دی۔

”دیکھو....!“ اس نے کہا۔ ”مجھے دور جن لفافوں اور اتنے ہی پویٹ کارڈوں کی ضرورت
ہے اگر لادو تو برا کام کرو۔ ابھی کافی وقت ہے۔“

”لادوں گا! مس صاحب۔“ دہ دانت نکال کر بولا۔ ”یہ بھی کوئی کام میں کام ہے۔“
رشیدہ پانچ کا نوٹ نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی۔ ”بیکھہ تمہارے ناشتے کے لئے۔“

”اڑے..... ہی..... ہی..... ہی.....“ چپر اسی نے ایک بار پھر دانت نکال دیئے۔

رشیدہ نے اطمینان کا سائز لیا۔ ذائقۂ اتنی دور تھا کہ آدھ گھنٹے بے قبل اس کی واپسی ناممکن

"اچھا تو تم بیہیں بیٹھو۔" حید المحتا ہوا بولا۔ "ابھی آفس میں والیں نہ جانے۔ اس چیز اسی کو دیکھتی رہو اور اس سے جو کچھ بھی منگولیا ہے باہر ہی لے لو تو بہتر ہے پھر تم نہایت آسانی سے اسے سمجھا سکتی ہو کہ تم ابھی آفس والیں نہ جاؤ گی۔ کیونکہ تمہیں ایک دوسرا ضروری کام ہم یاد آگیا ہے۔ سمجھ گئیں۔"

"اچھا پھر ہے۔"

"اپنے وقت سے آفس جاؤ گی۔"

"ٹھیک لیکن اگر چہر اسی نے اس کا تذکرہ کسی سے کر دیا تو۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم نے ضرورتا تو ملازمت کی نہیں ہے۔"

حید ریستوران سے چلا گیا اور رشیدہ باہر آبیٹھی۔ اس نے بیرے کو بلا کرنا شے کا آرڈر فریا اور نیچے پاٹھ پر نظریں جوادیں۔ ابے ڈر تھا کہ کہیں چپر اسی نکل نہ جائے۔

چپر اسی خلاف موقع جلد ہی نظر آگیا۔ لیکن ساتھ ہی رشیدہ کو ایک دوسرا خیال بھی آگیا۔ وہ بلدی میں اپنا فاکل میز پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا وہاں پالیا جانا قطعی ہنا سب تھا لہذا اس نے چپر اسی کو باہر ہی روکنے کا خیال ترک کر دیا۔ ابھی سماڑھے آٹھ ہی بجھ تھے۔

اس نے جلدی جلدی الناسید ہاتھا شے کیا اور باہر نکل آئی۔ آفس پہنچنے تو چپر اسی لہک کر اٹھا۔

"میں ذرا ناشتہ کرنے چل گئی تھی۔" رشیدہ نے اس سے لفافے اور پوٹ کارڈ لیتے ہوئے چپر اسی بنے لقیہ پیے بھی واپس کرنے چاہے لیکن رشیدہ نے لینے سے انکار کر دیکھ چپر اسی

ٹلام کر کے بوڑھنے لگا۔ "خدا آپ کا بھلا کرنے۔ بچے کے لئے چل ہو جائے گی۔ مس صاحب پرے آٹھ پہنچے ہیں۔ بہت غریب آدمی ہوں۔ بیہاں کل سائٹھ روپے ملتے ہیں نہ انعام نہ بخش۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔"

"چچچچ...!" رشیدہ غمناک انداز میں سر ہلا کر بولی۔ "میں کسی دن تمہارے پھوٹے سے لئے کئے آؤں گی۔"

"اے.... آپ مس صاحب.... ہم غریب آدمی ہیں۔"

"غریب سے کیا ہوتا ہے ہمارے بھائی ہو۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے۔" چپر اسی پیشانی کی طرف ہاتھ لے جاتا ہوا بولا۔ "مگر... مس

تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھولा۔ بیہاں کچھ زیادہ فرنچ پر نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اس کے پیچے ایک چکر کھانے والی کرسی اور ایک تجویری، دونوں بازوں میں دو بڑی بڑی الماریاں تھیں جن کی چوڑائی نے دونوں طرف کی دیواروں کو تقریباً ڈھک لیا تھا۔ رشیدہ نے سب سے پہلے دونوں الماریوں کے پیچے جھانک کر دیکھا۔ دیواریں سپاٹ تھیں۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کے پیچے لکڑی کا ایک بڑا صندوق نظر آیا جو مغلل نہیں تھا۔ رشیدہ نے یونہی بے خیال میں اس کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اور پھر دوسرا صندوق میں اس کی بساں بڑی طرح پھول رہی تھی۔ پورا صندوق روپا اور زے سے بھرا ہوا تھا اور یہ شب بالکل نئے تھے۔

رشیدہ نے یہیں ایڈ جعفری کی تجارت کے مقتعل اچھی طرح چھان بیٹن کی تھی اور اسے یقین تھا کہ اسلوچن جات کی تجارت اس فرم میں نہیں ہوتی تھی۔ اس نئی دریافت سے پیدا ہو جانے والے جوش نے فی الحال چور دروازے کا خیال تو اس کے ذہن سے نکال ہی دیا۔ صندوق کا ڈھکن بند کر کے وہ ائمہ پاؤں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

وہ کچھ ذیر تک اپنی میز پر بیٹھی ہاپنچی اور چھرے سے پیٹھ پوچھتی رہی پھر یکبارگی اٹھی اور باہر نکل آئی۔ اس نئے ٹھکرے سراغِ رشمی کے ان آدمیوں میں سے کسی کی غلاش تھی جنہیں فریدی نے یہیں ایڈ جعفری کے دفتر کے قرب و جوار میں رہنے کی تائید کی کر دی تھی۔

سامنے والے ریستوران میں اسے ایک جانے پہنچانے چھرے کی جھلک دکھائی دی۔ سر جنٹ حید ھا اور اب تک اسی ٹھکاری ہی والے بھین میں تھا۔ رشیدہ نے شیزی سے سڑک پر کی اور ریستوران میں داخل ہو گئی۔

"ہلو!..!" حید نے سکر اکرانے آٹھ ماری۔

"میں نے ایک نئی دریافت کی ہے۔" رشیدہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "اس کہیں میں اٹھ چلو۔" وہ دونوں بھین میں آکر بیٹھنے لگے اور رشیدہ نے پردہ کھینچ دی۔ پھر اس نے جلدی بلدی اپنا کارنامہ دھر لیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اسلوچن کی تجارت ہوتی ہے۔" حید نے پوچھا۔

"سو فیصدی یقین ہے۔"

راحیلہ بیٹھے گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔
”آخر بات کیا ہے؟“ رشیدہ نے حیرت سے پوچھا۔
”کوئی بات نہیں۔“ سب انپکٹر نے کہا اور سکریٹ سلاگنے لگا۔
ٹھیک دس بجے جعفری افتر میں داخل ہوا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھکانہ پر انہیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
”آہم...!“ غراہب سنائی دی۔ ”کیا بات ہے۔“

”اس کمرے کی تلاشی لئی ہے۔“ سب انپکٹر بولا۔
”کیوں؟“
”اوپر سے حکم ملا ہے اور یہ رہا تلاشی کا وارث۔“
”آہم...!“ جعفری کی غراہب بڑھ گئی۔ ”اس جماعت کا مقصد۔“
”تم یہاں ضفول باتیں سننے کے لئے نہیں آئے۔“ ایک سب انپکٹر بگڑ کر بولا بھر اس پہنے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دزانہ جعفری کے کمرے میں گھستے چلے گئے۔ رشیدہ کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور وہ بازار اپنے ہونوں پر زبان پھیر رہی تھی۔
”شاید ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ جعفری بنے رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
”میں جیسی باری میں کافی لیتے اندرون جا رہی تھی۔“ راحیلہ نے شکایت آئیز لجھ میں کہا۔
”لیکن انہوں نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔“ جعفری بلند آواز میں بولا اور رشیدہ متھر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے ان کی شامت آئی ہے۔

یہ جملہ دراصل پولیس والوں کو منانے ہی کے لئے کہا تھا۔
”جعفری اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسکے بعد راحیلہ بھی انہی اور رشیدہ نے اس کی تقدیم کی۔ سب انپکٹر بکس کا ذہن انٹھائیے اپنے ساتھیوں کو گھویر رہا تھا اور بکس بالکل غالی تھا۔ رشیدہ کے پیروں تسلیتے زمین نکل گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ جعفری پولیس والوں کی طرف متوجہ تھا۔ رشیدہ اشیدہ کے پیروں کی بدلتی ہوئی غالتوں سے کم از کم کھلکھل ضرور جاتا۔

”آخر مطلب کیا ہے؟“ جعفری گرج کر بولا۔
”ار... بات یہ ہے۔“ سب انپکٹر گھبرائے ہوئے تجھے میں بولا۔ ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ،“

صاحب ایک بات کہوں... آپ نئی ہیں۔“

”کیا... کہو کہو۔“

”صاحب براہ راست آدمی ہے۔ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا اس کا حکم ہے کہ ذوقت سے پہلے آؤ اور ذوقت کے بعد رکو۔ ولایت ہو آیا ہے تا۔ پانچ برس وہاں رہا ہے۔ کہتا ہے سب کام قادرے سے ہونا چاہئے۔ اگر اسے کبھی معلوم ہو گیا کہ آپ ذوقت سے پہلے آئی تھیں... تو۔“

”اوہ...!“ رشیدہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تو میں چل جاؤں۔“

”ہاں مس صاحب وہ بہت نہ آدمی ہے۔“

”تو تم کسی سے کہو گے نہیں۔“

”ارے نہیں صاحب۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت براہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا تھا اس نے جلدی سے فائل کو الماری میں ڈالا اور اپنا پینڈ بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

”بیچیہ وقت اس نے دوسرا سڑک کے ایک ریستوران میں گزارا اور ٹھیک سوانو بجے وہاں سے آفس چل پڑی۔ آفس پہنچتے سڑک پر نوچ گئے۔ بڑے کرنے میں دو پولیس انپکٹر چند کاشیلوں کے ساتھ موجود تھے اور راحیلہ کھڑی انہیں گھویر رہی تھی۔ رشیدہ بھی ابھی آئی تھی۔ اس نے رشیدہ کی طرف بھتی خیز نظر وہ سے دیکھا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ رشیدہ نے بھی چھرے پر حیرت کے آثار بیدا کئے اور راحیلہ سے سر کے اشارے سے ان کی موجودگی کا مطلب پوچھا راحیلہ نے نئی میں سر ہا دیا۔“

”رشیدہ نے اپنا فائل نکالا اور تاہپ رائٹر سنجال بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ترا اٹھا کر ایک سب انپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”کس کا انتقال ہے آپ کو۔“

”جعفری صاحب کا۔“ اس نے جواب دیا۔
”انتہی میں راحیلہ شاید کسی کاغذ کے لئے جعفری کے کمرے میں جانے لگی لیکن سب انپکٹر نے اسے روک دیا۔

”کیوں؟“ راحیلہ گھر اکر بولی۔

”یونہی! تشریف رکھئے۔“

ایک سب انپکٹر تھے خانے کی طرف بڑھا لیکن پھر رک کر جعفری کی طرف دیکھنے لگا جو کری پر بیٹھ کر اپنا پاپ سلاگنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بھنوئیں تان کر سب انپکٹر کی طرف دیکھا اور پاپ کو دانقوں میں دبائے ہی دبائے کہنے لگا۔ ”جاونا... لیکن میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میرے پاس بر باد کرنے کے لئے وقت نہیں۔“

وہ سب انپکٹر تین کا نیٹلوں کے ساتھ نیچے آت گیا۔ دوسرا اوپر ہی رہا۔ ”لڑکیو! بیٹھ جاؤ۔“ جعفری رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ابھی یہ لوگ نہ کا تباشہ دکھائیں گے۔“

”میں کہتا ہوں۔“ سب انپکٹر نے جھلا کر کہا۔ ”آپ اتنے بد تہذیب کیوں ہیں۔“

”آہم... آدمی کو بیچان کر بر تاؤ کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہارے لئے پر ہر جانے اور ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کروں گا.... مذاق ہے۔“

توڑی دیر بعد انپکٹر و اپس آگیا اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”شراب کی پیٹیاں ہیں.... اور غالباً....!“ ”جباب....!“ جعفری نے اس کی بات کاٹ کر مضحكانہ انداز میں کہا۔ ”اور فرم کے پاس دلائی شراب درآمد کرنے کا لائنس بھی ہے۔“

”پیٹیاں کھلی ہیں یا بند۔“ انپکٹر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”بند ہیں۔“

”تو وہ کھوئی جائیں گی۔“

”کھولو....!“ جعفری لاپرواٹی سے بولا۔

تقریباً دو گھنٹے تک کام جاری رہا لیکن پیٹیوں میں شراب کی یو تکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکلا۔ تہہ خانے میں کسی دوسرا دروازے کی بھی ٹلاش کی جا رہی تھی لیکن بے سود... پولیس والے ہائپنے ہوئے تہہ خانے سے نکلن آئے۔

”میں پورے آفس کی ٹلاشی لوں گا۔“ ایک بولا۔

”ضرور بولو....!“ جعفری غرایا۔ ”کم از کم دلاکھ ہر جانے کا دعویٰ کروں گا۔“ رشیدہ کی حالت اتر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فریدی کو کیا جواب دے گی۔ آفس کے

یہاں.... اس کمرے میں کوئی چور دروازہ ہے۔“

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے سب انپکٹر نے کمرے کی دیواروں کو کھنکھانا شروع کر دیا تھا۔

”گٹ آؤٹ۔“ جعفری حلق کے بل چین۔ اس کی خوف ناک آنکھیں ابل پڑی تھیں اور پھرہ پہلے سے کہیں زیادہ بہت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ ”لیکوئچ چلیز...!“

”آلی نے سے گٹ آؤٹ۔“ جعفری ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”مجھے مجبور نہ کیجئے کہ میں آپ کو حرast میں لے لوں۔ آپ اس طرح براہ راست حکومتی اہلکاروں کی توہین کر رہے ہیں۔“

دفعٹ جعفری اپنارویہ بدلت کر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے! لیکن آپ کو بھی یہ نہ چاہئے کہ معزز اور بے ضرر شہریوں کی توہین کرتے پھریں۔ فرض کرو کہ اگر یہاں کوئی چور دروازہ ہے بھی تو حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔“

”پکھ دیر قبل....!“ سب انپکٹر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”یہاں سے کچھ غیر قانونی اشیاء اسی چور دروازے سے باہر لے جائی گئی ہیں۔“

”یقیناً... حکومت نے کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے۔“ جعفری نے تیغ لبھ میں کھا اور پھر اس سب انپکٹر سے بولا، جو دیواریں کھنکھانا تا پھر رہا ہے۔ ”کیوں؟ پلاسٹر اور وقت بر باد کر رہے ہو۔ یہ رہا چور دروازہ۔“

اُس نے بڑی میز کو دھکا دیا اور وہ ایک تیز قسم کی آواز کے ساتھ چکنے فرش پر پھسلتی ہوئی دوسرا طرف چل گئی۔ پھر اس نے میٹل پیس پر رکھے ہوئے ایک آدھے بجسے کاسر گھمایا۔ کھنکھا کی آواز کے ساتھ فرش کا درمیانی حصہ کھلک گیا اور ایک تاریک سی خلاء ظاہر ہو گئی۔

”یہ ہے وہ چور دروازہ۔“ جعفری غرایا۔

پولیس والے کبھی حرمت سے اسے دیکھتے تھے اور کبھی تہہ خانے کے تاریک دہانے کو۔

”جاوہ دیکھو....! کیا ہے اس میں۔“ جعفری پھر غرایا۔ ”شاید وہ غیر قانونی اشیاء اسی کی منتظر رہی ہوں.... جاؤنا.... وہاں بھیڑیے نہیں ہیں۔“

دوسرے کروں کی بھی تلاشی لگی لیکن نتیجہ وہی صفر۔ ریو اور توکیاریو اور کی تصویر بھی نہ مل سکی۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد جعفری نے چنگاڑا چنگاڑا کر سارا دفتر سر پر اٹھایا۔ پولیس والوں کے چلے پر بھی وہ کافی دریک بیٹھا کسی غصیلے بلڈاگ کی طرح غراہا تھا۔

آفس نام کے بعد رشیدہ باہر نکلی تو نبیری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ بن شینڈ پر حمید سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہ وہاں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا یہ اسی رات کا بدلہ تھا۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”خدا کی قسم مجھے خود جرت ہے۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ ”میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم بھی سمجھو گے۔“

”بہر حال مجھے کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اس وجہ سے اور پریشانی ہے کہ میں نے فریدی صاحب سے مشورہ لئے بغیر تلاشی کا وارث نکلوالا یا تھا۔“

”پھر اب بتاؤ میں کیا کروں۔“ رشیدہ بے لمبی سے بولی۔

”اس لڑکی سے میرا تعارف کر ادوجو تمہارے کمرے میں پیشی ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔

”مت فضول بکو۔“ رشیدہ نے ایک بے جان سے مگر اہم کے ساتھ کہا۔ ”وہ بہت شریف لڑکی ہے۔“

”لڑکی تو ہے.... اگر وہ سینٹی بھی ہوتی تو میں اسے برداشت کر لیتا۔“

”کسی وقت تو سنجیدہ ہو جایا کرو۔“

”کبھی نہیں۔ آج صبح تمہاری ہی بدولت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ نتیجے میں یہ ذات نفیس ہوئی خیر اچھا پھر سکی! نانا۔“

وہ فٹ پا تھوڑے پر ریکنے والی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دو مرکار

آر لکچو میں بڑا شاندار پروگرام تھا۔ سردیوں کی خوشگوار رات تھی اور اس لئے اور بھی خوشگوار تھی کہ دوسرے دن اتوار تھا۔

سر جنٹ حمید اور ناگر بیٹھے بڑی دیر سے رقص میں شرکت کرنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں وہ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں آئے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور جھکن نے انہیں مذہل کر دیا تھا۔ ناگر تو جس وقت سے آیا تھا برابر بیٹھے جا رہا تھا۔ حمید وقت شکاری کے لباس میں نہیں تھا۔ البتہ میک اپ وہی پرانا تھا۔ اس نے عمدہ قسم کا ڈزنسوٹ پین رکھا تھا اور کافیوں میں ہیرے ڈال لئے تھے۔ بہر حال وہ اس وقت راجپوتوں کی کسی شاہی نسل کا ایک متول فرد معلوم ہو رہا تھا۔ چڑھی ہوئی گھنی سیاہ موچھیں ظاہری وجہت میں خاص اضافہ تھیں۔

”ابے اوڈا نگر۔“ حمید ناگر کی بولی پر کاگ رکھتا ہوا بولا۔ ”اب بس کرو۔“

”باس! بھی سے باس۔“ ناگر انگلی نچا کر بولا۔

”اے تمہیں بیڑ سے بھی نشہ ہو جاتا ہے۔“

”چو تھی بوتن ہے... ہی ہی ہی میں کیا نشہ۔“

”ابے چلن بھی سکو گے اب تم! مینڈک کہیں کے۔“

”مینڈک ہی ہی ہی.... مینڈک... مینڈک کا اچار کھلایا ہے تم نے کبھی۔“

”مت بور کرو۔“ حمید بھننا کر بولا۔

”آج میں بہت اداس ہوں۔“ ناگر رک رک کر بولا۔

”نہیں دیواداں ہو.... مت دماغ چاٹو۔“

”دیواداں بھی پیتے پیتے مر گیا تھا۔... اور میں بھی کسی دن پیتے پیتے مرجاوں گا۔... م...“

اڑ... کنور صاحب... میں حمید صاحب کہنے جا رہا تھا۔... کیا نام بتایا تھا آپ نے۔“

”کنور رنجیت سنگھ۔ اگر تم ذرا بھی بہکے تو اتنا ہا تھوڑا سید کروں گا۔“

”میں تم سے کمزور نہیں ہوں... ہاں۔“ ناگر بھنوئیں چڑھا کر بولاتے۔

”نہیں نہیں تم رستم ہو۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ وہ ذر رہا تھا کہ کہیں ناگر نشے میں ہاتھ سے نکل جائے۔ دفتار اس کی نظریں جھفری پر جم گئیں جو کاؤنٹر پر بار میں سے باشیں کر رہا تھا۔

”ناگر ڈیڑے۔“ حمید بولا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو۔“

ناگر نے مڑ کر دیکھا۔ اس وقت جعفری مجھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یک بیک حمید نے محسوس کیا جیسے ناگر کا نشہ ہی ہرجن ہو گیا ہو۔ وہ پلٹ کر خوفزدہ نظر وہیں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ

ہی وہ اپنے خنک ہو نہیں پر زبان بھی پھیرتا جا رہا تھا۔
 ”کیوں...!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
 ”اس کی آنکھیں...!“ تاگر آہستہ سے بڑا بولایا۔
 ”جنہیں پسند نہیں آئیں۔“ حمید نے ہنس کر کہا۔
 ”میں جا رہا ہوں۔“ تاگر اٹھنے لگا۔
 ”بیٹھو...!“ حمید اس کے کانہ سے پرہا تھر کھ کر بولا۔
 ”آنکھیں... مجھے نہ روکئے۔“
 ”بیٹھو...!“ حمید نے زبردستی اُسے بٹھادیا۔ تاگر بُری طرح کانپ رہا تھا۔
 ”بیسر اور منگاوں۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”خنہیں...!“ تاگر نے آہستہ سے کہا۔ وہ اب بھی مژمڑ کر جعفری کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔
 ”آخر بات کیا ہے۔“
 ”وہ آنکھیں۔“
 ”ارے تو بولونا بایا شعر ہے یا مسرع۔“
 ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جنہوں نے مجھے دریا میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔
 ”اوہ...!“ جنہیں یقین ہے۔
 ”بالکل ویسی ہیں۔“
 ”تو خپر بھاگنے کی ضرورت نہیں۔“
 ”میری جان نہ مجھے۔“
 ”چپ بے... ذیوٹ۔“
 تاگر ایک طرف گردن ڈال کر بینچے گیا۔
 ”وہ تمہیں اس میک اپ میں پیچان نہ سکے گا۔“ حمید نے اسے تسلی دی۔
 ”کون؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ... ارے۔“
 ”چپ رہو پھرندی۔“
 ”خیر جان تو جانی ہی ہے کیوں نہ میں ہی...!“ تاگر کا کانپتا ہوا تھا اُس کی جیب کی طرف

جارہا تھا۔
 ”خبردار... پاگل ہوئے ہو۔“ حمید نے اس کا ہاتھ کپڑا لیا۔
 ”مجھے یقین ہے کہ یہی مشر کیوں ہے۔“ تاگر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولنا۔
 ”بکون نہیں.... محض آنکھوں کی بناء پر.... اور پھر تم یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ آنکھیں تمہارے مشر کیوں کی ہیں۔“
 ”پھر یہ ہے کون...!“ تاگر نے پوچھا۔
 ”جیس ایڈ جعفری کی فرم کا جزل میجر مشر جعفری۔“
 ”اوہ تب تو۔“ تاگر کی آواز میں پھر کپکپاہٹ تھی۔ ”تب تو... پھر آخر فریدی صاحب نے اس کے پیچے آدمی کیوں لگائے ہیں۔“
 ”پتہ نہیں! چلو چھوڑو۔ ہمیں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ جیسا کہا جائے گا کریں گے۔ ہائے کیا کیا یلا لیلیاں نظر آرہی ہیں۔“
 ”یلا لیلیاں کیا؟“ تاگر نے پوچھا۔ لیکن وہ اب بھی خوفزدہ نظروں سے جعفری ہی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔
 ”ابے تم یلا لیلی نہیں سمجھے۔“
 ”نہیں۔“
 ”یلا لیلی خوبصورت لڑکی کو کہتے ہیں لفظ ”لڑکی“ میں ”ر“ مجھے بہت گراں گزرتا ہے اور پھر خوب صورت لڑکی اُسے تو چکلیا ہی سانام دینا چاہئے۔ یلا لیلی بہت مناسب ہے۔“
 ”زبردستی خواہ مخواہ۔“ تاگر نے منہ بنا لیا۔ وہ دراصل کسی طرح جعفری کے خیال سے پیچا چھڑانا چاہتا تھا۔ جواب ہال میں نہیں تھا۔
 ”زبردستی کیوں؟ ذرا اس یلا لیلی کی آنکھیں تو دیکھو۔“ دفتاً حمید چونک کر بولا۔
 حمید ایک لڑکی کو بڑی توجہ اور دل چھپی سے دیکھ رہا تھا۔
 ”واقعی لا جواب آنکھیں ہیں۔“ تاگر بڑا بولایا۔
 ”لیکن تم کو کسی اور کی آنکھیں بھی یاد آرہی ہوں گی۔“
 ”کس کی؟“

”خدا کی قسم یہ کنول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ حمید سید حاہو کر بولا۔
”کنول....!“ تاگر ہنسنے لگا۔ ”شاید آپ اس کی شکل بھول رہے ہیں۔“
”اور شاید وہ بھی تمہاری موجودہ شکل بھول جائے۔“
”تو کیا میک اپ ہے۔“ تاگر نے پوچھا۔
”قطعاً! یہ آنکھیں اور یہ گردان جھنکنے کا مخصوص انداز کنول ہی کا ہو سکتا ہے۔“ حمید اپنی جگہ
سے اٹھتا ہوا بولا۔

آرکشن اسٹرڈی ہو گیا تھا۔ لوگ رقص کے لئے اپنی ہاتھیں چھوڑ رہے تھے حمید جھپٹ کر اس
لڑکی کے قریب پہنچا۔
”لیکن آپ سے رقص کی درخواست کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے سلیقے سے جھک کر کہا۔
”جج... جی ہاں... مجھے خوشی ہو گی۔“
اس دوران میں آرکشن اسٹرڈی دھن بدی اور والٹر بننے لگا۔ وہ دونوں رقصاصوں کی بھیڑ میں
آگئے۔ لڑکی نے اپنا جسم تان کر ٹھوڑی آگے کی طرف نکالی اور کوہلوں کو پیچھے ہٹا کر حمید کے
کاندوں پر زوال ڈال دیا اور حمید نے اسے گول گول چکر دینے شروع کر دیئے۔
”آپ کو دلماز کا بڑا سلیقہ ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

”شکریہ۔“
”آپ کے بال بڑے حسین ہیں۔“
”اور آپ کی موچیں۔“ لڑکی مسکرائی۔ ”حالانکہ نقی ہونے کی وجہ سے ایسی معلوم ہوتی
ہیں جیسے کسی امر و در پر گھاس اگ آئی ہو۔“

”اوہو....!“ حمید نے ہلاکا سا قہقہہ لگایا۔ ”لیکن آپ کی آنکھوں کے کنول بیمیشہ شاداب
رہیں گے۔“
لڑکی ایک طویل سارس لے کر بولی۔ ”تو تم نے پیچاں لیا۔ امر و درخت۔“

”دور ہی سے پیچاں گیا تھا۔“
”تو پھر گرفتار کر دوں۔“
”ہے ہے! تمہیں میں گرفتار کراؤ گا... تمہیں یہاں لی کو...!“

”یہ کیا بلایہ ہے۔“
”میری لغت میں انہائی حسین لڑکی کو کہتے ہیں۔“
”تم نکار ہو۔... ہر جائی کہیں کے امیں تمہیں کوئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔“
”پھر بھی تمہارے مالک نے مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنایا۔“ حمید نے لمحہ میں حیرت تھی۔
”بھلام تم جیسے البا لکو۔“
”میں البا ہوں۔“ حمید نے بُر امان کر کہا۔
”بگڑو نہیں میری لغت میں البا انہائی شریر لڑکے کو کہتے ہیں۔“
”کنول ڈار لگ مجھے حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔“ بے چارے تاگر کا توہہت بڑا حشر ہوں۔
”اس مخترے کا حشر۔“ کنول ہنس کر بولی۔ ”واقعی بہت بڑا ہوا ہے۔ یہ کر کی چار چار بو تلیں
ایک ہی نشت میں صاف کر دیتا ہے۔“
”ارے تم اسے بھی پیچاں گئی ہو۔“
”کیوں نہیں! مجھے عرصہ سے تم لوگوں کی جلاش تھی۔“
”کیوں....!“
”مالک کا حکم! اور جس دن میں نے اطلاع دے دی تم لوگوں کا ٹھکانے لگا دیئے جاؤ گے۔“
”ابھی تک کیوں نہیں دی۔“
”میری مرضی۔“
”کل کہاں ملوگی۔“
”کہیں نہیں.... لیکن تمہارے گرو گھٹنال کا پتہ آج تک نہ چلنے کا۔“
”اور تو یہ کہو! اس طرح پتہ لگانا چاہتی ہو۔“
”یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے تکلیف سے بچانے کے لئے خواب اور دوادی تھی۔“
”اس ہمدردی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید ہنس کر بولا۔
” مجرم بھی آدمی ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے ان کے سینے میں پھر کا کلکڑا نہیں ہوتا۔“
”ٹھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”تو.... تم آج تک اپنے مالک کی شخصیت کے
تعلق کچھ نہیں معلوم کر سکیں۔“

”تم ایک بخت بھرنے دل کے متعلق بہت کچھ جانتی ہو۔“ کنول نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم روز دی کسی نہ کسی لڑکی کو یہ وقوف بناتے ہو۔ ہر جائی ہو تو۔... ہری چک۔“

”میں نے آج تک کسی لڑکی کو بے وقوف نہیں بنایا بلکہ بتاہی رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک کتوارا ہوں۔“ حمید کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ بو تارہ۔ ”بہتری لڑکوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں کیڑے نکال دیئے کسی نے کہا کہ تمہاری ایک ناگ چھوٹی ہے اور ایک بڑی۔... اچھا تمہیں بتاؤ۔... اتنی دیرے سے ناق رہا ہوں تم نے کچھ محسوس کیا؟“

۱ ”نہیں تو!...!“

”اگر ایک ناگ چھوٹی ہوتی تو میں باقاعدہ چمد کتا ہوتا۔ ایک لڑکی نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ دیا کہ کھٹائی دیکھ کر میری رال پسکنے لگتی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں بڑھاپے میں بالکل کھوست معلوم ہونے لگوں گا۔“

”اور میں یہ کہتی ہوں کہ تم سے بڑا مکار آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔... وہ کوڑوں کی مار مجھے اب تک یاد ہے اور اس پر تمہارا رد یہ۔ کوئی اوز ہوتا تو اس کے منہ سے آواز بھی نہ لکھتی۔“

”خوب یاد دلایا۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ لڑکی نادرہ کہاں ہے۔“

”پیچے نہیں۔... اب میرے ساتھ نہیں ہے۔“

”کنول ڈار لنگ۔... میں مرتے دم تک تمہیں یاد رکھوں گا۔... ہائے وہ پہلی ملاقات وہ چاندنی رات اب بھی اکثر ڈہن کے تاریک گوشوں میں پھسل آتی ہے۔ کاش یہ کم بخت تمہارا مالک درمیان میں حائل نہ ہوتا۔ میں اسے کسی دن تحریز یو پرفون کر دوں گا۔“

”بہت اچھے۔“ کنول نے قہقہہ لگایا۔ ”اس طرح تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اب اس سے رابطہ قائم کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“

”چل دیکھیں سمجھ لو۔... ویسے تم مجھے مکار تو سمجھتی ہی ہو۔“ حمید مخصوصیت سے بولا۔

”فی الحال پیغام رسانی کے لئے آدمی استعمال کئے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ ان آدمیوں تک اس کے پیغام کس طرح پہنچتے ہیں۔“

وفتحا حمید کی نظر تاگر کی طرف اٹھ گئی جو میز پر سراوندھائے بیٹھا تھا۔ اس نے رقص میں

”دنیں۔... اب میں اسے پچانی کے تختے ہی پر پہنچانا پسند کروں گی۔“

”یہ تبدیلی کیوں؟“

”محض اسلئے کہ وہ آجی نہیں جاؤ رہے۔ اسے بہتے ہوئے خون بسے بیمار ہے وہ بھیڑا ہے۔“

”جعفری کو جانتی ہو۔“

”کون۔... وہی خوفناک آدمی۔... جو انہی کا وائز پر تھا۔“

”ہاں۔... وہی۔“

”آج کل اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔“ کنول بولی۔

”کیا خیال ہے کہیں وہی تو تمہارا مالک نہیں۔“

”پتہ نہیں۔... ویسے میں نے اسے اپنی لش پر رکھ لیا ہے۔“

”لش پر۔“

”ہاں مجھے بھی تو تمہاری ہی طرح مجرموں کی تلاش رہتی ہے۔“

”کیوں۔...؟“

”جس کے متعلق ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ کسی قسم کا مجرم ہو سکتا ہے میں اس کے پیچھے لگ جاتی ہوں اور پھر اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے مالک کو اطلاع دیتی ہوں اور پھر وہ اسے

بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔“

”تمہاری بھی ڈیوٹی ہے۔“

”ہاں۔...!“

”فی الحال میری سب سے بڑی آنزو بھی ہے کہ۔...!“

”میکا۔...؟“

”ہم سے مل کر کام کرونا۔“ حمید نے اپنی آنکھیں نشی بنا کر آہستہ سے کہا۔

”یہ کسی طرح ممکن نہیں۔“

”اوہ نہیں۔... چکر پورا نہیں ہوان۔“ حمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بیاں پیر۔... ٹھیک۔... کنول ڈار لنگ تم تجھے بڑی پیاری ہو۔“

”تم سور ہو۔... مجھے بے وقوف مت بتاؤ۔“ کنول نے اس کے شانے پر چکلی لی۔

بھی شرکت نہیں کی تھی اور پھر اسے جعفری دکھائی دیا جو ناگر کے قریب ہی کھڑا اسکی عورت سے باٹیں کر رہا تھا۔ عورت کی پشت حمید کی طرف تھی۔ اتنے میں آرکشنر اینڈ ہو گیا تھا۔ رقص اپنی میزوں کی طرف لوٹنے لگے۔ جعفری سے گفتگو کرنے والی عورت مجھے کی طرف مڑی اور حمید نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی۔

شریف بھیریا

رشیدہ اس وقت کی طرح جعفری سے پچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ اگر اسے ذرہ برابر شبہ بھی ہوتا کہ جعفری اسے یہاں مل جائے گا تو وہ ادھر کارخانہ کرتی۔ دن بھر کی کوفت دور کرنے یہاں چلی آئی تھی۔ ویسے اسے یہاں جعفری کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت ہی خنک اور غیر سوچ قسم کا آدمی ہے اور پھر اسے بھول کر بھی یہ موقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس سے ہنس ہنس کر باٹیں کرے گا۔ بہر حال وہ اس کے اس روایہ پر نکلکن ضرور گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید جعفری کو اس کی تلاشی والی حرکت کا علم ہو گیا تھا اور اب وہ اس طرح اسے کسی جاں میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

رشیدہ نے سر جنٹ حمید اور ناگر کو بھی دیکھا تھا۔ دوسرا اداڈ شروع ہوتے ہی حمید پھر اسی لاکی کے ساتھ ناپنے لاگتا۔ جس کے ساتھ اس نے نپلے رقص کیا تھا۔ ناگر کو میز پر سر اونڈھائے دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شاید زیادہ پی گیا ہے۔ کیونکہ شراب کی بوقت اب بھی اس کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

”آؤ..... لاؤخ میں چلیں۔“ جعفری نے دوسرا اداڈ شروع ہوتے ہی رشیدہ سے کہا۔ لااؤخ بالکل خالی تھی۔ وہاں بیٹھنے والے سب کے سب رقص میں شرکت کرنے پلے گئے تھے۔

جعفری نے بیٹھتے ہوئے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”لاکی تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا۔“ رشیدہ کو اپنی روح جسم سے پرواز کرتی معلوم ہونے لگی۔ وہ اس سے آنکھیں چرارہی تھی۔ ”تم شاید میری آنکھوں کی طرف دیکھنا پسند نہیں کر تیں۔“ جعفری نے خوفناک آواز میں ہنس کر کہا اور جیب سے تاریک شیشوں کی عینک نکال کر اگالی۔ کچھ دیر رشیدہ کی گھبرائیت سے غالباً

لطاف اندوڑ ہوتا رہا پھر نرم لبھے میں بولا۔ ”میں نے تمہارے متعلق سب کچھ پتہ لگالیا ہے۔“

رشیدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔

جعفری نی بوتا رہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم نیو اسٹار کے زائد اسٹاف میں تھیں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم وہاں سے ایک رقم کو خرد برد کر دینے کے لازام میں نکالی گئی ہو۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سائز لیا۔ حقیقتاً نور نے یہی چال چلی تھی۔ غالباً اس کے لئے اسے نزدیکی سے یہی مشورہ ملا تھا۔ رشیدہ کی علیحدگی کی وجہ غبن دکھائی گئی تھی۔

رشیدہ نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا اور بڑے مسکین لبھے میں بولی۔ ”پھر میں کیا کر دیں۔ کیا بھوکون مر دی۔ اگر میں علیحدگی کی اصل وجہ ظاہر کر دیتی تو مجھے کون ملازم رکھتا۔“

”لکھی رقم تھی؟“

”صرف ساڑھے تین سوروپے جو میں نے ایک سو لیکن سب سے زر خلافت کے طور پر وصول کر کے بعض ضروریات پر صرف کر دیئے تھے۔ میرا رادہ تھا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی طرح نہیں کر دوں گی۔ مگر اچانک اس ایکنٹ کی ملاقات براؤ راست فیجھ سے ہو گئی۔“

”خیر..... لکرناہ کرو۔ مجھے توقع ہے کہ تم کم از کم میرے ساتھ اپنا نام کرو گی۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بڑی دلیر لڑکی ہو اور میں کم از کم ہر دلیر فرد کو دولت مند دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ رشیدہ نے کہا۔

جعفری نے ایک دیٹر کو اشارے سے بلا کر کافی کے لئے کہا اور پھر رشیدہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”میں تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”بھی....!“ رشیدہ کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن اس بار وجہ خوف نہیں تھی، بلکہ اپنے مقصد میں کامیابی کا خیال اس کے ذہن میں یہ جان برباکے ہوئے تھا۔

”تمہیں دولت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے مخصوص اسٹاف میں جگہ دینے کے متعلق غور کر رہا ہوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ رشیدہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”لیکن لڑکی! ایک بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ تم مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرو گی۔“ ”دھوکا! نہیں کبھی نہیں۔ دھوکہ تو میں نے انہیں بھی نہیں دیا۔ میری نیت درست تھی۔“

”میں دیدہ دانستہ اس پر سختی کرتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”کافی خوبصورت لڑکی ہے اگر کسی جال میں بچنے گئی تو.... اس کا خاندان تباہ ہو جائے گا۔“

اس کی بیوہ اندھی ماں....!“

”آپ جانتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔“ جعفری بولا۔ ”میں اسی لئے اس پر سختی کرتا ہوں کہ وہ سکھار کرنا چھوڑے۔ دفتر کے کئی کلرکوں نے اس پر ذورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے معاملات کو آگئے نہ بڑھنے دیا۔“

”جسچا آپ فرشتہ ہیں۔“

کار شہر کی ایک دریان سڑک پر جا رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ دفتار شیدہ چونکہ کربولی۔

”بُن اب دور نہیں ہے۔ میں دراصل ایک آدمی کی عدم موجودگی میں تمہیں اُس سے ملاتا چاہتا ہوں۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی مگر اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”کیا تم ڈر رہی ہو۔“ جعفری نہ کربول۔ ”میری نظروں میں عورتوں کا بہت احترام ہے۔“

اس نے یک یہک ایسی شکل بنائی جیسے کچھ سنخے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفتار اس نے رشیدہ سے کہا۔ ”میا کار ڈرائیور کرتا جانتی ہو۔“

”جی ہاں۔“

”اچھا تو چند منٹوں کے لئے اسٹینرگ سنبھال لو۔“

رشیدہ نے اسٹینرگ پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل کر پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔

”فکر مت کرو، اسٹینرگ کرتی رہو۔“ اس نے آہتہ سے کہا۔

وہ پچھلا شیشہ گرا کر اندھیرے میں گھونٹنے لگا۔ بہت دور سڑک پر ایک بہت بڑا اور متخرک تاریک و دھبہ ساد کھائی دے رہا تھا یہ دراصل ایک کار تھی۔ جس کے ہیڈ لاٹیس روشن نہیں تھیں۔ غالباً جعفری کی کار کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ جعفری نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک

میں کسی نہ کسی طرح وہ رقم ضرور پوری کر دیتی۔“

”جعفری تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔“

”تمہیں میرے لئے تھوڑی سی سراغ رسانی کرنی پڑے گی۔“

”سراغ رسانی۔“ رشیدہ چونکہ پڑی۔

”ہاں! دفتر ہی میں۔“ جعفری پر خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے دفتر میں بھیڑوں کی کھال میں کچھ بھیڑ یے بھی گھس آئے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”اس شہر میں میرے کچھ حریف بھی ہیں جو مجھے نقصان پہنچانے پر تلے رہتے ہیں۔ تلاشی والا واقعہ تم بھولی نہ ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ دفتر ہی کے کسی فرد کے اشارے پر ہوا تھا۔“

”اوہ.... لیکن...!“

”مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہے۔“ جعفری ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کل سے تمہاری تاخواد پانچ ہو روپے ماہوار لے گی اور اس سراغ رسانی کے سلسلے کے اخراجات الگ... بولو! کر سکو گی۔“

”ضرور کر سکوں گی۔“ رشیدہ بُر بُر اپنے پانچ سوروپے۔ آپ بہت اچھے ہیں اور آپ اتنی نہ بھی دیجے تو میرا فرض تھا۔ بالکل کے نمک حراموں کو جہنم رسید ہی ہونا چاہئے۔“

”مجھے تم سے یہی موقع تھی۔“ جعفری مسکرا کر بولا۔

”دونوں خاموشی سے کافی پیٹے رہے“ پھر جعفری بولا۔ ”یہ راؤٹھ ختم ہونے سے پہلے ہی ہمیں اٹھ جانا ہے میں تمہیں اس وقت ایک ایسے شخص سے ملانا چاہتا ہوں جس کے پیچھے تم کل ہی سے لگ جاؤ گی۔“

”بہتر ہے۔“ رشیدہ نے جلدی جلدی کافی پی اور پھر جعفری میں اوکر کے اٹھا۔ دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکل آئے۔ جعفری کی کار قریب ہی کھڑی تھی۔ اُس نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھوئی اور رشیدہ اس کا شکریہ اوکر کے اندر بیٹھ گئی۔ جعفری اُس کے برابر بیٹھ کر اسٹینرگ کرے لگا۔ کار شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ رشیدہ نے موقع میں آکر راحیلہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”میں جانتا ہوں وہ بڑی ایماندار لڑکی ہے۔“ جعفری بولا۔

”آپ سے ڈرتی بہت ہے۔“

”میرے زیادہ تر روپے وہی ہضم کر لیتا ہے اور اب تو مجھے اس سے کچھ کچھ نفرت سی ہو چلی ہے۔ نیواشار کے دفتر والی رقم دراصل اسی پر صرف ہوئی تھی۔ اس سورنے میری ذرا بھی بد دندہ کی۔“

”تو تم اس سے الگ ہونا چاہتی ہو۔“

”میں تو چاہتی ہوں لیکن وہ میرا پیچھانہ چھوڑے گا۔“

”اور اگر میں چھڑاؤں تو۔“

”عمر بھر آپ کا احسان بانوں گی۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا۔ ویسے وہ سو فیصد ی پولیس کا پھوٹ ہے۔“

”ایسا تو نہیں.... وہ پولیس والوں سے رقم اینٹھنا خوب جانتا ہے۔ انہیں اس بڑی طرح بلک میں کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ جعفری نے کہا اور کاری کی رفتارست ہو گئی۔ تھوڑی دور پل کر ایک کچھ راستے پر مڑی اور شاید ایک یا ڈیڑھ فرلانگ کی مسافت طے کرنے کے بعد رک گئی۔ جعفری اتر پڑا۔ رشیدہ بھی اتری لیکن سہی سہی سی نظروں سے اندر ہیرے میں گھور رہی تھی۔ یہاں چاروں طرف جھائیاں ہی جھائیاں نظر آرہی تھیں اور سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کی کھڑکیوں سے زور رنگ کی ہلکی روشنی چھپ رہی تھی۔ دونوں مکان میں داخل ہوئے اور جعفری نے دروازہ بند کر کے ایک دشتیاں قبھہ لگایا۔

رشیدہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ جعفری کی آنکھیں حدود نجہ بھیاں نظر آنے لگی تھیں۔

”کیوں چوہیا۔“ اس کی غرابیت بلند ہو گئی۔ ”تو ایک بھیڑیے کو راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

رشیدہ چیخ مار کر ایک صوفے پر گر گئی۔

جعفری نے پھر ایک قبھہ لگایا لیکن یہ قبھہ معنوی اعتبار سے قبھہ ہرگز نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی شیر دھاڑ کر رہ گیا ہو۔

رشیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ڈی تھی۔

”فریدی ہی نے بھیجا تھا تھے۔“

”نہیں.... نہیں.... یہ جھوٹ ہے۔“ رشیدہ خوفزدہ آواز میں چیختی۔

را انفل نکالی جس کی نال میں نیچے کی طرف ایک بڑی سی نارنج فٹ تھی۔ ”چلتی رہو۔“ وہ آہتہ سے بولا۔ ”ڈر نامت میں فائز کرنے جا رہا ہوں۔“

”کیوں....؟“ رشیدہ کانپ کر بولی۔

”چھوڑ کمپنی کا کوئی آدمی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“

”قتل! نہیں نہیں۔“ رشیدہ بوکھلا گئی۔

”اوہ....!“ جعفری غریا۔ ”میں صرف اس کی کار کا ایک ناٹر چھاڑ نے جا رہا ہوں۔“ اس نے را انفل سیدھی کی۔ ٹریگر پر انگلی رکھتے ہی نارنج روشن ہو گئی اور ساتھ ہی فائز بھی ہوا۔ گوئی تعاقب کرنے والی کار کے اگلے پیسے پر لگی تھی۔

غیر ارادی طور پر رشیدہ کا ہاتھ گیئر پر جا پڑا۔ اور کار کی رفتار کم ہو گئی۔

”کیا کر رہی ہو۔“ جعفری غریا اور رشیدہ کو رفتار پھر تیز کر دینی پڑی۔ جعفری پھر بولا۔

”بہت ڈر پوک ہوت۔“

”مجھے کشت و خون سے دلچسپی نہیں۔“ رشیدہ نے کہا۔

”تو کیا میں خونی ہوں۔“ جعفری گیوکر بولا۔

”بھی نہیں۔“ رشیدہ نے جلدی سے کہا۔

جمعفری پھر انگلی سیٹ پر آبیٹھا اور کار ڈرائیور کرنے لگا۔

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم پہلے کسی زمانہ میں پولیس سے مل کر کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی کرتی ہو یا نہیں۔“ جعفری اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

”حالات پر محصر ہے۔“ رشیدہ نے بے پرواہی سے کہا لیکن اس کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔

”اونور تھا راشوہر ہے۔“

”نہیں صرف دوست ہے۔“

”بڑے کام کا۔.... آدمی ہے اگر اسے بھی میرے ہی فرم میں لے آؤ تو کیا حرج ہے۔“

”ہرگز نہیں۔ بلکہ میں آپ سے یہ استدعا کروں گی کہ میری تنخواہ میں اضافے کا علم اسے نہ ہونے پائے۔“

”کیوں....؟“

ہوئے تھے.... اور.... وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔

"تمہارے حمایتی۔" وہ گرج کو بولے۔ "لیکن دیکھنا ہے کہ وہ تمہیں یہاں سے کس طرح لے جاسکتے ہیں۔ پولیس... ہوں... پولیس میرے نزدیک بے جان کھلونا ہے، جس کی اسپرگ ہب چاہوں توڑوں۔ تلاشی میں، کیا ملا تھا انہیں اور تم نے کیا دیکھا تھا... یعنہ...!"

گرفتاری اور فرار

رشیدہ کو غائب ہوئے دس دن گذر گئے تھے۔ اس دوران میں انور نے جیس اینڈ جعفری کا پورا دفتر ہلاکر رکھ دیا لیکن کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوا۔ جعفری نے رشیدہ سے جو کچھ بھی کہا تھا حق کر دکھایا۔ پولیس اس کا باطل بھی بیکاہ کر سکی۔ ایک طرف اس نے خود حکم پولیس ہی پر ہر جانے اور دکھایا۔ پولیس اس کا باطل بھی بیکاہ کر سکی۔ ایک طرف رشیدہ کے خلاف ایک روپرٹ بھی ازالہ حیثیت عرفی کا داد عویٰ دائر کر کھا تھا اور دوسرا طرف رشیدہ کے خلاف ایک روپرٹ بھی درج کرائی تھی۔ ان نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ اس کی تجویری کاتالا توڑ کر پندرہ ہزار روپے کے نوٹ نکال لے گئی ہے۔ ثبوت میں اس نے رشیدہ کا پینڈ بیگ پیش کر دیا جو اسے ٹوٹی ہوئی تجویری کے پاس ہی پڑا ملا تھا۔ تجویری کے پینڈل پر رشیدہ کے انگلیوں کے نشانات مکمل گئے۔ یہ تجویری اسی کے کمرے میں رکھی رہتی تھی۔ اس واقعے والی شام کو جعفری نے رشیدہ کو تجویری کی کنجی دے کر اس میں سے کچھ نکالنے کو کہا تھا۔ اس طرح تجویری کے پینڈل پر اس کی انگلیوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے اور جعفری نے اس وقت تک اگلی حفاظت کی تھی جب تک پولیس نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

نہ صرف انور بلکہ حمید اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے لئے سرگردان تھے۔ البتہ فریدی کا کہیں پہنچنے تھا۔ اب تو حمید کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ حمید کو یقین کامل تھا کہ رشیدہ کو جعفری ہی نے غائب کیا ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو وقوعے والی رات کو آر لکھو میں ساتھ دیکھا تھا۔ اسے اب رہہ کرافتوں ہو رہا تھا کہ اس نے ان دونوں پر نظر کیوں نہ رکھی۔ اس دوران میں بھی کئی حادثات رونما ہوئے تھے۔ ذی۔ آئی۔ جی کی ہدایت کے مطابق ذاکر نارنگ نے اپنا دیکھی بلکہ غالی کر دیا تھا اور ذی۔ آئی۔ جی نے اس کی گمراہی کرنے کے لئے حکم ضراغ رسانی کے دو انکسٹر مقرر کر دیئے تھے لیکن دوسری صبح ان دونوں کی لاشیں ملیں۔ ان کے

"مجھے جھوٹا کہتی ہے۔"

"ہاں....؟"

"کیا....؟"

"نہیں تھیں....!"

"تیرے جسم کا ایک ایک ریشدہ الگ کر دوں گا اور کسی کو کافیں کان تک خبر نہ ہو گی۔"

رشیدہ کچھ نہ بولی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔

" بتاؤ! فریدی کہاں ہے؟" جعفری نے اس کی گردنٹ نٹولتے ہوئے کہا اور پھر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

" بتاتی ہوں۔" رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی اور جعفری نے اس کی گردنٹ چھوڑ دی۔

" میں نہیں جانتی۔" اس نے اپنی گردنٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ " پانی... پانی۔"

" تم نہیں جانتیں۔"

" ہاں اس نے مجھے ایک خط کے ذریعے آپ کے یہاں ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔"

" اور تم نے ملازم ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ کیوں کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ شہر میں جتنے بھی قتل ہوئے ہیں ان میں میرا ہاتھ ہے۔"

" یہ میں نہیں جانتی۔ اس نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں ہوشیاری سے سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہوں۔"

" تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے۔"

" میں نہیں جانتی۔"

" خیر... اب اس وقت تک تمہاری رہائی ناممکن ہے جب تک تم یہ سب کچھ اگلے دو۔"

جعفری نے رشیدہ کی گردنٹ پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر انہیں ایک پتلی سی ڈور سے باندھنے لگا۔ دفتار ان دونوں پر ایک بہت ہی تیز قسم کی روشنی پڑی اور فوراً ہی غائب ہو گئی۔ جعفری غراتا ہوا کھڑکی کی طرف چھٹا۔ باہر بدستور تاریکی پھیل ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر چلا گا لگادی۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح قرب وجوار میں گھٹ پھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہانپتا ہوا کمرے میں واپس آگیا۔ رشیدہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے

سر بڑی بے دردی سے کچلے گئے تھے اور لاشیں راستے پر ڈال دی گئی تھیں اسی رات کو ڈاکٹر نارنگر پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ رات کا کھانا کھا کر پائیں بارغ میں ٹھلہ رہا تھا تو کسی نے اس پر چھرے سے حملہ کیا اور اس کا داہنا بازو زخمی ہو گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کو بیچاں نہیں سکا تھا۔ اگر وہ لڑنے پر آمادہ نہ ہو گیا ہوتا تو حملہ آور دوسرا اوار ضرور کرتا۔ اس کے نوکروں نے اس کی چیز سنی تھی۔

ان حادثات کے بعد ڈاکٹر نارنگر کے دمہی بیٹگلے اور شہری رہائش گاہ پر مسلح پولیس کا پیرہنا دیا گیا۔ لیکن ایک رات بیٹگلے کے پھرے داروں پر کسی نامعلوم آدمی نے دیسی بم پھینکے۔ نتیجہ ہے طور پر ایک ہلاک ہو گیا اور تین کے گھرے زخم آئے۔ البتہ اس کی شہری رہائش گاہ پر پھر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

اب تو ڈی۔ آئی۔ جی کو بھی فریدی پر تاؤ آنے لگا تھا۔ محکمہ سراغ رسانی پر چاروں طرف سے بوچھاڑیں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے پورے ملک کے بہترین دماغ ایک جگہ اٹھا کر دیئے تھے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر بھی گشت کرنے لگی تھی کہ حکومت عنقریب بر طافوں کی حکومت سے استدعا کر کے اسکا لینڈیارڈ کے نامور جاسوسوں کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی اپنے آفس میں بیٹھا بڑی طرح کھول رہا تھا کہ چپر اسی نے ایک کارڈ لا کر پیش کیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی پیشانی پر شکنیں ڈالے اس کارڈ کو چند لمحے گھورتا ہا پھر جھنجھلانی ہوئی آواز میں بولا۔ “آنے دو۔”

نیواسٹار کا کرامہ رپورٹر انور سعید پچھلے ہنارہ اندر داخل ہوا۔
”بیٹھ جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے مضطربانہ انداز میں کہا جس میں جھنجھلانہ بھی شامل تھی۔
”وہ لڑکی ملی یا نہیں۔“

”وہ تو نہیں ملی۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس کا سراغ معہ ثبوت مل گیا ہے۔“
”یعنی...!“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

انور نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس پر جھکتا ہوا بولا پھر سید حافظا ہو کر انور کو گھورنے لگا۔ انور کچھ نہ بولا۔
”بولنے کیوں نہیں، یہ کون ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے جھنجھلانا کر پوچھا۔

”جیس ایڈ جعفری کا جزل فیجر جعفری... اور دوسرا رشیدہ ہے۔“

”اوہ....!“ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اور غالباً یہی مشر کیو ہے۔“ انور بولا۔ ”اُسے کسی طرح علم ہو گیا کہ رشیدہ کو فریدی صاحب نے اس کی فرم میں ملازمت کرنے کی ترغیب دی تھی لہذا اس نے اُسے غائب کر دیا اور اس کی چالاکیوں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے کہ اس نے کس طرح پولیس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیا ہے اور کس خوش اسلوبی سے رشیدہ کو چور ثابت کر کے اس کے خلاف روپرٹ بھی درج کر دیا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی اس تصویر کو برابر گھورے جا رہا تھا۔ یہ جعفری اور رشیدہ کی تصویر تھی جس میں وہ رشیدہ کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ رہا تھا۔

”تمہیں یہ ملی کہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خط کے ساتھ فریدی صاحب کی طرف سے موصول ہوئی ہے۔“

”فریدی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چونک کر بولا۔ ”وہ ہے کہاں... ... خط لاو۔“

”پتہ نہیں... ... وہ کہاں ہیں۔“ انور جیب سے خط نکالتا ہوا بولا۔ ”دستی خط... ... آر لکھو کے دفتر سے ملا تھا۔“

کاغذ پر صرف دو سطریں تحریر تھیں۔

”تصویر بیچ گر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے اُسے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کے پاس لے جاؤ... ...“ ”F“

”ماں گاؤ... !“ ڈی۔ آئی۔ جی حیرت سے بولا۔ ”تو یہی شخص مشر کیو ہے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ انور نے کہا۔

”اچھا تو تم جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”آخبار میں اس کے متعلق کچھ نہیں آنا چاہئے۔“

”بہتر ہے۔“ انور نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسرالمحہ ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے انتہائی بیجان آفریں تھا۔ وہ خط اور تصویر لئے ہوئے

آئی۔ جی کے دفتر کی طرف پکا۔

پھر آوھے گھنٹے کے اندر ہی اندر جیس ایڈ جعفری کے دفتر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کسی کو سانس

”کیا؟ میں نہیں سمجھا؟“ ڈاکٹر نارنگ نے حیرت سے کہا۔
 ”آپ نے فون کیا تھا مجھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چھپھلا کر بولا۔
 ”میں نے ... نہیں تو۔“
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے بی سے بولا۔ ”وہ مشر کیوں بھی ہاتھ آتے
 آتے رہ گیا۔“
 ”کیا کیسے ... یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلے۔“ ڈاکٹر نارنگ بولا۔
 ”وہ لوگ ملا قاتی کمرے میں آکر بینٹے گئے۔“
 ”کیا مشر کیوں خصیت ظاہر ہو گئی؟“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔
 ”جی ہاں! لیکن اسے فی الحال اپنے ہی تک مدد و رکھئے گا۔ سردست تو وہ نکل بھی گیا ہے۔
 لیکن زیادہ دیر تک نہ بچ سکے گا۔ سارے ملک میں واٹر لس کے ذریعہ اس کا حلیہ جاری کر دیا گیا ہے۔
 ”کون ہے وہ؟“
 ”جیس ایڈ جعفری کا جزل نیجر جعفری۔“ ڈی۔ آئی۔ بولا۔
 قبل اس کے کہ ڈاکٹر نارنگ کچھ کہتا کمرے کے ایک گوشے میں غرائب سی ستائی دی۔
 ”جعفری حاضر ہے۔“
 ”وہ سب چوک کر مڑے۔“
 جعفری ایک دروازے میں کھڑا نہیں خونخوار نظر وہن سے گھور رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں¹
 روپ اور تھا۔ جس کارخانیں کی طرف تھا۔ وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔
 ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ جعفری غایا۔ ”مشر کیوں پر ہاتھ ڈالنا آسان کام
 نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی صاحب۔“
 ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سکھوں کو سانپ سو نگھ گیا ہو۔ البتہ ڈاکٹر نارنگ کے ہونٹوں پر عجیب
 طرح کی مسکراہٹ تھی۔ جعفری نے پتوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہھکھڑیوں کا جوڑا نکالا اور
 اسے ایک انپکٹر کی طرف اچھالتا ہوا بولا۔ ”اپنے ڈی۔ آئی۔ جی اور ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھوں میں
 لگاؤ... چلو... جلدی کرو۔“

انپکٹر نے طوعاً کرہا ایک ہھکھڑی ڈی۔ آئی۔ جی کے اور دوسرا ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھ میں

لینے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن خود جعفری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس نے عمارت کا گوشہ گوشہ چھلان
 مارا۔ جعفری کے کمرے والا تہہ خانہ بھی دیکھا گیا لیکن لا حاصل۔ ... دفتر کا سارا عمل حراست میں
 لے لیا گیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے منہ پر تھپٹر مارے۔ جلدی میں اس نے ایک
 زبردست غلطی کی تھی۔ محابرے سے پہلے اسے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ جعفری دفتر میں موجود
 بھی ہے یا نہیں۔ آئی۔ جی بھی اس کے سر ازام تھوپ رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی عقل رکھتا تھا
 اس کش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ہی متقدہ طور پر فریدی کو ہمراہ بھلاکہ
 رہے تھے۔

”کیا حماقت کی ہے اس لوٹے نے خود کو نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔“ آئی۔ جی بولا۔
 ”میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آخر اس کرام پولٹر کو تصویر بھیجنے کیا ضرورت تھی۔“
 ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خود آرائی کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔“

”بہت ہو چکا۔“ آئی۔ جی پھٹکا رہا۔ ”پانی سر سے اوچا ہو چکا ہے۔ میں آج ہی اسے معطل کرنا
 ہوں اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کا وارث بھی جاری کراؤں گا۔ بہت سرچ ہلایا گیا ہے۔ میں کسی
 ایسے آدمی کا وجود اپنے بھکے میں برداشت نہیں کر سکتا جو ڈسپلن برقرار رکھ سکے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے رسیور اٹھا
 لیا۔ چند لمحے بُر اسامنہ بنائے ہوئے سفارہ پھر ایک طویل ”اچھا“ کے ساتھ رسیور ٹھی دیا۔

آئی۔ جی سوالیہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”یہ تو جان ہی کو آگیا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بڑی بڑیا۔
 ”کون...؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نارنگ.... اب نہ جانے کون سی آفت ٹوٹی ہے کہ بلا رہا ہے۔“
 ”ابھی کیا ہے ایسے سارے لیڈر ناظم بند کر دیں گے۔ فریدی کے لوٹاپن کی وجہ سے بنا بھا
 کھیل بگڑ گیا۔“

ڈی۔ آئی۔ جی دو انپکٹوں کے ساتھ ڈاکٹر نارنگ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر
 نارنگ برآمدے میں کھڑا پائیں باغ میں پھیلے ہوئے کپوڑوں کے لئے دان ڈال رہا تھا۔
 ”فرمایے۔“ میں آج بہت مشغول ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔“

ذال دی۔ دوسرے سب انپکٹر کا ہاتھ جیب کی طرف جائی رہا تھا کہ جعفری نے اسے لکارا
”خبردار میں سر سے پیر تک آنکھیں ہی آنکھیں رکھتا ہوں۔“
”یہ کیا الغیرت ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی جلا کر چینا۔

”بائم روڈ پر نکلیں گے۔ موڑوں کے کارخانے کے پاس۔ گھبرائے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ
وہ ہیں گیا ہو گا۔ موڑوں کا کارخانہ اسی کا ہے۔ اس نے وہاں سے ایک موڑی ہو گی اور سیدھا سارگ
میشن گیا ہو گا۔“ فریدی نے کہا۔

”مجھے تواب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ مسٹر کیو ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اس سرگ میں دوڑتے وقت بھی نہیں۔“ فریدی کے لجھ میں تختراہ۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔

”آخر اتنا ادم حم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ایک انپکٹر بولا۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“ فریدی بولا۔ ”ذرار قفار اور تیز کیجئے۔“

ٹھوڑی دیر بعد انہیں روشنی دکھائی دی۔ پھر تن زیوں پر نظر پڑی دوسرے لمحے میں وہ باہر
تھے ایک بڑا سا پھر ایک طرف پڑا تھا جو غالباً ذا کٹر نارگ کے نکلنے سے پہلے سرگ کے دہانے پر
دکھا رہا ہو گا۔ چاروں طرف کردنے کی کائنے دار اور بے ترتیب جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔
انہوں نے بروقت تمام راستہ بنایا اور باہر نکل۔ سڑک زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے جزل
موڑ گیراج نک آئے۔ کم از کم ذی۔ آئی۔ جی کے لئے تو یہ نئی اطلاع تھی کہ وہ گیراج ذا کٹر نارگ
ی کی ملکیت تھا۔ گیراج کا منتظم باہر ہی مل گیا۔

”ذا کٹر صاحب آئے تھے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔

”تمہاری تھے۔“ فریدی گھبرائے ہوئے لجھ میں بولا۔ گیراج کا منتظم دونوں انپکٹروں کو
بڑت سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے ریو اور کارتوسون کی پیشیاں لگا رکھی تھیں۔ منتظم نے
دواب میں سرہلا دیا۔

”اُف فو۔“ فریدی نے بے چینی سے کہا۔ ”انہیں منع کیا گیا تھا کہ تمہارا پاہر نہ نکلیں۔ کتنا
نظرہ ہے ان کے لئے.... کدر گئے۔“

”ایک کار لے کر اڑھ رکھے ہیں۔“ منتظم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”کوئی اور گاڑی فالتو ہے۔“

”جی ہاں ہے۔“

”فون بھی ہے یہاں.... اچھا ذرا اگاڑی جلدی سے نکلا پئے۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

”مر کار ناراض نہ ہوں۔“ جعفری قدرے جھک کر بولا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے سر پر تھا
اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک جھرنا سامار۔ بالوں کے ساتھ چہرے کی کھال بھی
اتری چل گئی اور جب وہ سیدھا ہوا تو ذی۔ آئی۔ جی اور دونوں انپکٹر بے ساختہ جیچ پڑے۔ ”فریدی۔“
”دفاتر ذا کٹر نارگ ذی۔ آئی۔ جی پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں کے دائیں اور بائیں ہاتھ ایک ساتھ
جکڑے ہوئے تھے اور دوسرے دائیں بائیں آزاد تھے۔ دونوں ایک ساتھ زمین پر آ رہے۔ قبل
اہ کے کہ وہ لوگ سنھلتے ذا کٹر نارگ اٹھ کر بھاگا۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح اپنا ہاتھ ہجھڑی
سے نکال لیا تھا۔ ہجھڑی بدستور بند تھی۔ فریدی ذا کٹر نارگ کے پیچھے دوڑا۔ اس کے پیچھے وہ
تینوں بھی بھاگے۔ وہ سارے کروں میں ناپتھے پھر رہے تھے اور ذا کٹر نارگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔
”میں بھی شاید پاگل ہو گیا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ایک ست دوڑ نے لگا۔ ایک کمرے میں
پنچ کروہ ایک لحظہ کے لئے رکا۔ یہاں ایک میز اٹھی پڑی تھی غالباً وہ دیوار سے لگی رہی ہو گی۔

”یہ ہجھڑی لو۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے اپنے ہاتھ میں جھولتی ہوئی ہجھڑی کی طرف دیکھ کر
کہا۔ ایک انپکٹر نے آگے بڑھ کر ہجھڑی نکال دی۔

فریدی دیوار سے لگے ہوئے ایک ایک ریک پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ دفاتر ایک اپنی جگہ سے
کھک کر ایک طرف ہو گیا۔ سامنے دروازہ تھا وہ چاروں دیوانہ وار اندر گئے۔
”برخلاف طریقہ تھا۔“ ذی۔ آئی۔ جی بر براہ رہا تھا۔

”جناب والا۔“ فریدی نے مڑے بغیر کہا۔ ”آپ محاصرہ کر کے تو اسے پکڑی نہیں سکتے
تھے۔ اس عمارت کے پیچے سرگوں اور تمہارے خانوں کا جاں بچا ہوا ہے۔ گھبرائے نہیں! میں جانتا
ہوں کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔“

وہ ایک کشادہ سرگ میں دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کچھ نہ پکچھے بولنا چاہتا تھا لیکن ان
کے دم گھٹ رہے تھے۔ سرگ تاریک اور معفن تھا۔

”لیکن سن تو سکی۔“ ذی۔ آئی۔ جی ہانپتا ہوا بولا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

فریدی مضر برانے انداز میں ہاتھ ملنے لگا۔

”فون ہے آئیے۔“ منتظم گھر اگیا تھا۔ فریدی نے فون پر ہاتھ ڈالا۔

”ہللو... کو تو ای... ذی۔ آئی۔ جی آف ائیم جس سپینگ... ساگر مینشن کا محاصرہ فوراً کر لیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں سمیت... فوراً... جلدی۔“
رنیشور رکھ کر فریدی باہر بھاگا۔ کار باہر کھڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اسٹیرنگ سنجلا اور
اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ کار تیزی سے بیلی روڈ کی طرف مڑی اور دونوں انپکٹر دوں کے ر
ایک دوسرے سے مکرا گئے۔

لاشوں کی بارش

”آف فو! اکتنا بے وقوف بنے میں ہم لوگ... اس کی گرفتاری کے بعد بھی شاید کسی کو
مشکل ہی سے یقین آئے کہ وہ خود ہی مشرک ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”میرے پاس شوتون کا انبار عظیم ہے۔“ فریدی نے لاپرواں سے کہا۔
”حمد کہاں ہے۔“

”پتہ نہیں! ہو گا کہیں۔“ فریدی بولا۔ ”اس بار میں نے انہیں بھی دھوکے میں رکھا ہے
جنہیں خود ہی کام پر لگایا تھا۔“ ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔

”حمد تک کو اس کا علم نہیں کہ مشرک ہو کون ہے۔ وہاب بھی جعفری کی تلاش میں ہو گا۔“
”لیکن... کیوں؟“

”اطمینان سے عرض کروں گا۔ فی الحال تو میں بھی امید و نیم کی حالت میں ہوں۔“
”اگر نکل گیا تو بہت برا ہو گا۔“

”ساگر مینشن کے علاوہ اور کہیں نہیں جا سکتا۔“ فریدی نے کہا۔
”یقین کی کوئی وجہ۔“

”ہیڈ کوارٹر ہی ہے پانچ دنوں سے متواتر میں اسی چکر میں رہا ہوں اور یقین واٹن ہو جائے؛
اُن اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ اُف فو! آج تو یہ فاصلہ کسی طرح کم ہی نہیں ہو رہا ہے۔“

”دیکھوں فقار کم کرو۔ ہم شہر کے آباد حصے میں داخل ہو رہے ہیں۔“

”غالباً پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہو گی۔“ فریدی نے فقار کم کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے فون پر ایف فو... بڑی غلطی کی۔“ ذی۔ آئی۔ جی بے چینی سے بیٹھا گئے۔
رگڑنے لگا۔

”جی... کیسی غلطی۔“

”تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ نارگ ہی مشرک ہو گی۔ اگر وہ انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا تو۔“

”مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں پولیس پہنچ بھی گئی ہو گی تو ابھی شاید ہی عمارت میں داخل ہو سکی ہو۔“

”کیوں؟“

”وہاں مشرک کو کے سامنے ستر آدمی رہتے ہیں اور ڈاکٹر نارگ کا ذہنی توازن فی الحال بگرگیا
ہے ورنہ وہ اس طرح نہ جھاگتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنا محاط آدمی تھا۔ خود اس کے آدمیوں کو اس کا علم
نہیں کہ مشرک ہو کون ہے۔ اس نے ہر طرح اپنی مضبوطی کر رکھی تھی۔ اگر وہ اس طرح نہ جھاگتا تو
اسے مجرم ثابت کرنے میں مجھے دانتوں پسند آ جاتا اور میں نے یہ ڈرامائی انداز مخفی اس لئے
اختیار کیا تھا کہ اسے اچاک ذہنی طور پر انتشار میں بٹلا کر دوں اور وہ گرفتاری کے وقت رد عمل
کے طور پر کوئی اضطراری حرکت کر بیٹھے مگر مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بند ہنگھٹری سے
ہاتھ نکال لے گا۔“

”واقعی تم اس سے بھی زیادہ بھیاںک ہو۔“ ذی۔ آئی۔ جی فریدی کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ”اگر
خدا نخواستہ کہیں تم بھی غیر قانونی راستوں پر نکل گئے ہوئے تو ہم لوگوں کے لئے ایک مستقل درد
سر ہو جاتے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔ دفعتاں اس نے کار کی رفتار بالکل کم کر دی اور ذی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر

آہستہ سے بولا۔ ”سن رہے ہیں آپ۔“

”ارے! یہ تو مشین گنوں کی آوازیں ہیں۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے اچھل کر کہا۔

”وہ دیکھئے۔“ فریدی نے سامنے اشارہ کیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور ساگر مینشن سے
چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ پولیس کا کہیں پہنچنے تھا۔

فریدی نے بڑی پھرتی سے کار بیک کی۔ اگر وہ دوڑھائی سو گز اور آگے بڑھ گئے ہوئے تو کار
گولیوں کی زد پر آ جاتی۔ فریدی نے کار کو اگلی گلی میں موڑ دیا۔ ساگر مینشن مقابل سمت کی لائن میں

تھی۔ گلی کے اندر سبھے ہوئے آدمیوں کا ہجوم تھا اور پولیس والے بھی سراسیمگی کا شکار ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ فریدی کا روک کر کوڈ پڑا۔ وہ سب بھی اترے، اور بھیڑ میں گھستے چلے گئے۔

آگے چل کر ایس۔ پی سے مذبھیڑ ہو گئی۔ وہ ذہنی۔ آئی۔ جی کی طرف چھٹا۔

”ہمارے آئنے سے قبل ہی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔“ وہ گھبرائے ہوئے لجھے میں بولا۔ ”میرے خدا نہ جانے کتنی لاشیں ساگر مینشن کے سامنے پڑی ہیں.... اور.... آئیے میرے ساتھ۔“ ایس۔ پی انہیں لے کر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اور پری منزل پر پہنچ کر اُس نے ایک کمرے کے روشنдан کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب روشندانوں سے جھانکنے لگے۔ یہ عمارت ٹھیک ساگر مینشن کے سامنے تھی اور یہ لوگ اس کے عقبی راستے سے داخل ہوئے تھے۔

روشندانوں سے آنکھیں لگاتے ہی فریدی اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے بیک وقت ”اڑے“ نکل گیا۔ گولیاں ساگر مینشن کے ان نتوں سے نکل رہی تھیں جو غالباً بارش کا پانی نکلنے کے لئے لگائے گئے تھے۔ ایک ایک فٹ باہر نکلے ہوئے تل جن کا جھکاؤ غالباً پھر ڈکری کے زاویے سے سڑک کی طرف تھا۔

”ایسے ہی تل۔“ ایس۔ پی بولا۔ ”پوری عمارت میں چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ غالباً چوتھی ست بھی گولیاں برس رہی ہوں گی۔“

ساگر مینشن کے ٹھیک نیچے فٹ پاتھ پر لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ”مگر وہ لاشیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”وہ تو گولیوں کی زد میں نہیں۔ وہاں ان کا ڈھیر کی معنی رکھتا ہے۔“

”اور.... اف۔“ عمارت کا ایک مکین آگے بڑھ کر ہائپٹا ہوا بولا۔ ”مجھ سے پوچھتے... میرے خدا.... میرے حواس درست نہیں۔ وہ لاشیں ساگر مینشن ہی سے گری ہیں۔ لاشوں کا آبشار.... خدا کی قسم.... لاشوں کا آبشار۔ وہ اس طرح گر رہی تھیں جیسے بارش ہو رہی ہو۔ سب سے پہلے لاشیں گریں اور پھر.... ان نتوں سے گولیاں نکلنے لگیں۔ میرا بھائی.... ہائے کہیں!“ بھی.... نہ مارا گیا ہو.... میرے خدا.... اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

وہ خاموش ہو کر ائٹھے پاؤں دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ گولیاں برابر سے جا رہی تھیں۔ فریدی نے ایک بار پھر فٹ پاتھوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھا اور نیچے اتر آیا۔ ”تو اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی ٹھکانے لگادیا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اب کیا کیا جائے۔“ ذہنی۔ آئی۔ جی پاگلوں کی طرح آنکھیں نکال کر بولا۔ ”فون.... یہاں اس عمارت میں کوئی فون ہے۔“ فریدی ایس۔ پی کی طرف مڑا۔ ”وہ تو ہو گا ہی! یہ بتائیے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ذہنی۔ ایس۔ پی نے کہا۔ ”مسٹر کیو۔“ فریدی مضطرباً نہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس عمارت میں موجود ہے۔“ ایسا معلوم ہوا جیسے ایس۔ پی پر بم گر پڑا ہو۔ وہ حرمت سے منہ اور آنکھیں چھاڑے کھڑا رہا۔ ”کیوں بھی! فون ہے یہاں۔“ فریدی ایک آدمی کی طرف مڑا جو غالباً اسی عمارت کا کوئی فرد تھا۔ ”جی ہاں! آئیے میرے ساتھ۔“

وہ دونوں تیزی سے اترے۔ دوسرے لمحے میں فریدی کی انگلی میلی فون کے ڈائیل پر چل رہی تھی۔ اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”ہیلو.... ہیلو۔“ جواب میں ایک خوفزدہ سی نسوانی آواز سنائی دی۔

”ڈاکٹر نارنگ سے کہو۔“ فریدی گرجا۔ ”کب تک گولیاں چلیں گی۔“ ساگر مینشن کا ایک تنفس زندہ نہ بچ گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ساگر مینشن ایک سید ہی سادی کی عمارت ہے۔“ ”وہ پاگل ہو گیا ہے۔“ گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ ”مجھے بچاؤ.... میں ایک کمرے میں چھنسی پڑی ہوں۔ دروازے پر ایک بڑی وزنی الماری اگری ہے۔ میں اسے ہٹا نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے بچائیے۔“ ”تم کون ہو؟“ فریدی نے حرمت سے پوچھا۔

”ایک بے بس لڑکی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں زندہ نجگنی ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی نہ چھوڑے گا.... بچاؤ۔“ ”کیا وہ تھا ہے۔“

”ہاں.... اس نے سھوں کو مار ڈالا ہے اور اب ایک مرکزی مشین پر بیٹھا ساری مشین گنوں کو کنٹرول کر رہا ہے۔ خدار اکسی طرح آؤ۔ وہ پاگل ہو گیا ہے میں نہیں جانتی کہ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے۔“

”میں آپ کا حکم نہ مانتے پر مجبور ہوں۔“ فریدی نے پلٹ کر اُسے اسی نظر دوں سے دیکھا کہ ڈی۔ آئی۔ جی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی پاگل کی ویران آنکھیں رہی ہوں۔ بے حس اور خوفناک۔ فریدی ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا۔ لیکن ایس۔ پی دروازے میں حائل ہو گیا تھا۔

”براہ کرم ہٹ جائیے۔ وہاں تک پہنچنا کچھ مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس کمرے میں ہے۔ عمارت میری دیکھی ہوئی ہے۔ وہ بس انہیں اور پاگلوں کی طرح گولیاں بر سار ہے۔“

”لیکن جاؤ گے کس طرح۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے بولا۔

”وہ سارے ٹل دودوٹ کے فاصلے پر لگے ہوتے ہیں۔ اگر میں کسی دو ٹکوں کے درمیان فاصلے کوڑا ہن میں رکھ کر چلوں تو گولیوں سے نج سکتا ہوں۔“

”خطرناک اختیاری خط نراک.... ہرگز نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چیخ کر بولا۔

لیکن اتنی دیر میں فریدی ایس۔ پی کو دکا دے کر پایہر نکل چکا تھا۔
”پکڑو۔ اے پکڑو۔ پاگل... سور۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے تابناہ اس کے پیچے دوڑا لیکن

فریدی گلی میں بھرے ہوئے آدمیوں کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہاں پھر کھڑکوں کے قریب آگئے اور پھر انہوں نے فریدی کو تیجے فٹ پا تھوڑا دیکھا۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر گولیاں گز گز گزوں غبار اڑا رہی تھیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اوپر سے اُسے پھر آواز دی لیکن اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی رحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی نظریں پاپ پر جھوٹی تھیں اور پھر وہ جل پرالوگ پیچنے لگے۔ پھر اس نے اتنی تیزی سے سڑک پار کی جیسے پنکھا چک کی ہو۔ دوسرے فٹ پا تھوڑے پیچنے کر دیا۔ کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلانے لگا۔ ”ہے کوئی اس کی نکر کا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نہ پڑا۔ یہ بھی عجیب قسم کی تھی۔ کچھ گلوگیری جس میں شاید کچھ آنسوؤں کی نبی بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”زندہ باو بیٹھے از زندہ باد۔“ وہ ہاتھ مل کر بڑھا۔

فریدی نے نچلے سارے دروازوں پر نظریں دوڑا میں لیکن سب کے سب بند تھے۔ تیری منزل کی ایک کھڑکی کھلی نظر آرہی تھی اور اسی سے ملا ہوا ایک موٹا سا پاپ تھا جو نیچے نک چلا آیا۔

”وہ... وہی تمہارا مسٹر کیو ہے۔ تم کنوں تو نہیں۔“

”جی ہاں... جی ہاں... آپ کون ہیں... کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”فریدی... چپ چاپ پڑی رہو۔ وہ کس کمرے میں ہے۔“

”لا بہریری کے قریب والے میں جس میں مشینیں نہیں ہیں۔ فریدی صاحب خدا کے لئے مجھے بچائیے۔ اس نے سب کو مارڈ الاتادرہ... کر غل کی بہن کو بھی۔“

”لیکن... اس نے تھا۔ ان سکھوں کو کس طرح مارڈا۔“

”اوہ... بڑے خوفناک طریقے سے۔ اس نے عمارت میں داخل ہوتے ہی سکھوں کو انہما کیا اور کہا کہ منڈر کیوں کا حکم ہے کہ تم سب اوپر چلو۔ پھر اس نے ان سکھوں کو اوپری منزل پر لے جا کر چھٹ کے سرے پر بکھڑا کیا۔ خدا کی پناہ میں بھی انہیں میں تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک برین گن اٹھائی اور گولیاں بر سانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا اور وہ انہیں ہاہر باتھا۔ میں کسی نہ کسی طرح نکل گئی اور اب میں اس کمرے میں پھنسی ہوئی گولیوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ خدا کے لئے جلد پہنچے۔“

”اچھا لڑکی۔“ فریدی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”چپ چاپ پڑی رہو۔ میں آرہا ہوں۔“ وہ رسیور رکھ کر جانے کے لئے مڑا۔

ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ بھی اُسی کمرے میں آگئے تھے۔

”کیسے جاؤ گے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جس طرح بھی بن پڑے گا۔ جانا تو ہے ہی۔ وہ تھا ہے اور ایک مشین کے ذریعہ ان بندوقوں کو کنٹرول کر رہا ہے۔“

”نہیں... اس حالت میں... بھلا میں کیسے جانے دوں گا۔ اب میرے خیال سے اسے ٹھکنے ہی دو۔ لوگ ہوشیار ہو گئے ہیں اور اب کسی کے مرنے کا امکان نہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اس کے کانہ ہے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”وہاں ایک زندگی خطرے میں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس سے ہمیں تھوڑی بہت مدد بھی ملی ہے۔ میں اُسے اس کے رحم و کرم پر کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔“

”پاگل نہ بتو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔

تھا۔ فریدی نے اپنے جو تھے اتارے کوٹ کی جیب سے روپا اور نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالا اور کوٹ بھی اتار کر پہیں فٹ پاتھر پر پھینکا۔ اب وہ اسی پاپ کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ اسے بد قسمی ہی کہنا چاہئے کہ جب وہ اوپر پہنچ کر کھڑکی میں داخل ہو رہا تھا تو روپا اور اس کی جیب سے نکل کر نیچے فٹ پاتھر پر جا پڑا۔ فریدی نے جھک کر دیکھا اور پھر نہ اسامنہ بنا کر بڑا لایا۔ ”اوہ! جہنم میں جائے۔“

کمرہ خالی تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ پیروں میں جو تے نہیں تھے۔ اس لئے وہ کوئی آواز پیدا کئے بغیر بہ آسانی نقل و حرکت کر رہا تھا۔

عمارت کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ وہ دوسری منزل پر اتر آیا۔ مشین گنیں اب تک چل رہی تھیں۔ لا ببری ری کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا پھر آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھا جس کا پتہ کنوں نے دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ مجنونانہ انداز میں ایک پہنچ کو تیزی سے گھبائے جا رہا تھا۔ فریدی پنجوں کے مل چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر یکخت ڈاکٹر نارنگ پر ٹوٹ پڑا۔ ڈاکٹر نارنگ کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور پہیہ اس کے ہاتھ میں چھوٹ گیا۔ دونوں گھٹے گئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ کسی پا گل کتے کی طرح فریدی کو چھین ہو رہا تھا۔ ایک تو دیسے ہی کافی طاقتور تھا اور پھر اس وقت کا کیا پوچھنا دوسرا ہی لمحے فریدی کی قوت جواب دینے لگی۔ گولیوں کی آواز بند ہو گئی تھیں۔ فریدی نے اپنی پوری قوت سے نارنگ کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

”خبردار نارنگ۔“ دفعتاً دروازے کی طرف سے ایک نسوی آواز آئی۔ ”الگ ہٹو رنہ گولی مار دوں گی۔“

کنوں دروازے میں روپا اوز لئے کھڑی تھی۔ نارنگ کے حلق نے عجیب طرح کی ڈراؤنی آواز نکلی اور فریدی کو بس اتنا محسوس ہو سکا چیز۔ وہ بھی نارنگ ہی سے لپٹا ہوا کوئی فٹ اچھل گیا۔ آواز نکلی اور فریدی کو بس اتنا محسوس ہو سکا چیز۔ وہ بھی نارنگ ہی سے لپٹا ہوا کوئی فٹ اچھل گیا۔ ہو۔ پھر اس نے کنوں کی گھٹی گھٹی سی جیچ سکی۔ نارنگ ایک ہاتھ سے فریدی سے نپٹ رہا تھا اور دوسرے سے اس نے کنوں کو دبوچ رکھا تھا۔ کنوں کے ہاتھ سے روپا اور نکل کر دور جا پڑا۔ وہ کنوں کو بُری طرح دبارہ اتھا اور کنوں کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں چیز۔ اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ فریدی نے باسیں ہاتھ سے ڈاکٹر نارنگ کی ناک دبا کر ایک زور دار جھکا دیا اور اس کا سر اس کی

باہمیں بغل کے نیچے آگیا۔ فریدی کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ دابنے ہاتھ سے وہ کنوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جھلا کر نارنگ کی گدی پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ اس نے کنوں کو چھوڑ دیا اور وہ بے جان کی فرش پر آر ہی۔ ڈاکٹر نارنگ فریدی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فریدی کا دوسرا گھونسہ اس کے پیٹ پر پڑا اور وہ بلبلہ کر دو ہرا ہو گیا۔ اس کا سر فریدی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھالتا تیرا گھونسہ اس کی ناک پر پڑا اور وہ کسی مرتبے ہوئے ہمیسے کی طرح ذکر اکر چلتا ہو گیا۔

ذوبھے لمحے میں فریدی اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کے ندر کے والے ہاتھ نارنگ کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر رہے تھے۔

پولیس آگئی۔ ڈی۔ آئی۔ جی ساتھ تھا۔ فریدی نارنگ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نارنگ بے ہوش تھا۔ فریدی کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ قمیض نارنگ ہو گئی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ چہرے پر کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اسے سہارا دینا چاہا تھا۔ اسکے بغیر کنوں کے پاس پہنچا جو بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

”یہ ابھی زندہ ہے۔“ فریدی پاگلوں کی طرح حلق پھاڑ کر چینا۔ ”جلدی کرو۔ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ جلدی... نبض کمزور چل رہی ہے۔“

بے ہوش نارنگ کے ہتھیاریاں رکادی گئیں۔ اسے اٹھانے سے پہلے کنوں کو دہاں سے ہٹا دیا گیا۔ فریدی نے فاتحانہ انداز سے نارنگ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر سکراہٹ پھیل گئی جو اسی کے چہرے سے بنے ہوئے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اسے سہارا دیئے ہوئے اپنے رومال سے اسکے چہرے کا خون خشک کر رہا تھا۔

”اُسے ہسپتال بھجوادیا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں! ہاں... تم مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔“

”درندہ۔“ فریدی نے نارنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور ایک ہاتھ سے بھی زیادہ طاقتور اپنے نہیں اور کون کون سی جیوانی تو میں رکھتا ہے۔ ایک ترہ سلسلے سانپ کی طرح ہونٹا نیز بھی کر سکتا ہے۔ کرٹل کی بہن کو اس نے پہنچا نرم ہی کے اثر میں لے رکھا تھا اور وہ را لکھن بھی بیہیں کہیں ہو گی۔ وہ بے چاری لڑکی... اس کی لاش بھی بیہیں کہیں ہو گی۔“

"اچھا! اب تم چلو پہاں سے۔" ذی۔ آئی۔ جی بولا۔
"اوپری منزل پر کچھ لاشیں ضرور ہوں گی۔"

"اوه.... چھوڑو۔ سب دکھے لیا جائے گا... چلو۔" ذی۔ آئی۔ جی نے اسے دروازے کی طرف دھکیتے ہوئے کہہ دیا۔ "مگر نہیں پچھلی طرف سے چلیں گے۔ سڑک پر مجھ تھیں اور مجرم کو دیکھنے کے لئے بے تاب سپے۔"

وہ دونوں پچھلے دروازے سے نکل کر دوسرا سڑک پر پہنچ۔ ذی۔ آئی۔ جی نے ایک سب اسٹیٹر سے کار لانے کے لئے کہا۔

"میں شاید ننگے پیر ہوں۔" فریدی ہنس کر بولا۔ "اور میرے جسم پر چیختہ ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارا کوت اور جوتے نہ جانے کہاں ہوں گے۔ زیوال اور تو اٹھالیا گیا تھا لیکن ان کی طرف دھیان نہیں گیا۔"

اس سڑک اور ساگر میںش سے ایک سوچیں لا شین اٹھائی گئیں۔ شہر میں ایک بار پھر خوف وہر اس پھیل گیا تھا۔ لوگوں کو اس کی خوشی تو ضرور تھی کہ ایک اتنا خوفناک مجرم گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ دل گرفتہ بھی تھے کہ ایک دن میں ایک سوچیں جانیں چلی گئیں۔ زیادہ تر لوگوں نے پہلے اسے افواہ ہی تصور کیا کہ مسٹر کیوڈا کٹر نارنگ تھا۔ لیکن پھر یقین تو کرنا ہی پڑا۔ سرجن حمید اور ناگر نے طالوت جھشی اور نادرزہ کی لا شیں شناخت کیں۔

مسٹر کیو عدالت میں

محکمہ سراج رسانی کا ہال کچھ بچھ بھر ہوا تھا۔ شہر کے سارے بڑے حکام موجود تھے۔ انور اور رشیدہ کو پہلی صاف میں جگہ ملی تھی۔ سرجن حمید ناک بھوں چڑھائے پھٹا پھٹا پھر رہا تھا۔ فریدی کی تقریر کے دوران میں ایک مرتبہ بھی اس نے ہال میں قدم رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کیس کی تمیز کے بعد فریدی ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر جمع پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر بولا۔ "ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسٹر کیو کی شخصیت بڑے عجیب طریقے پر پرداز میں تھی۔ مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ سیکرٹ سروس کے پانچ آدمی اس نام کو استعمال کر رہے ہیں۔ میں ان کے ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اس اطلاع کے بعد ان کے متعلق چھان بین کرنا ضروری

ہو گیا۔ بہر حال مختصر ایک کہ میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ تو گالیا لیکن نہ توان کے ٹرانسپلر کا سراغ ملا اور نہ خود ان کا۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں شاید مجرموں نے ختم ہی کر دیا۔ لیکن سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر برابر یہی کہے جا رہا تھا کہ وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ اپنی تھخواہیں بھی لے رہے ہیں۔ بات عجیب تھی۔ مگر میں اپنے ہی نظریے پر جمارتا۔ آخر آج ڈاکٹر نارنگ نے اس بات کا اعتراف کر ہی لیا کہ اس نے ان پانچوں کو ختم کر کے ان کی چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک طرف وہ انہیں اپنے جرائم کا بھی آلہ کار بناتا رہا اور دوسری طرف سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا کہ ان پانچوں کی تھخواہیں تک حاصل کر تازہ۔ اس طرح وہ حکومت کے اہم رازوں میں بھی دخیل ہو گیا۔

"لیکن اس کا مقصد کیا تھا....؟" کسی نے سوال کیا۔

"مقصد.... اس نے اپنے خلاف لگائے ہوئے الزامات کا اعتراف کر لیا ہے لیکن.... مقصد مقصود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کا انتہاء عدالت ہی میں کرے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" ذی۔ آئی۔ جی نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا خیال! میرا خیال یہ ہے کہ ان کے سارے جرائم کے پس منظر میں کوئی اہم تنظیم نہیں تھی۔ اگر اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا تھا تو میدان سیاست کے بہترین کھلاڑیوں کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کے بر عکس اس کے آدمیوں میں بھی قانون کے مجرم نظر آتے ہیں۔ معمولی چور اچکے، قاتل، سازشی اور قانون ناجائز اشیاء کی تجارت کرنے والے۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ محض دہشت اور انتشار پھیلانے کے لئے تھا اور وہ بھی قطعی بلا مقصد! میں اسے ایک طرح کا جنون ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر نارنگ کی خطرناک کو مپلکس کا شکار ہے۔"

"خبر یہ بات بھی کھل ہی جائے گی۔ تم اپنا بیان جازی رکھو۔" ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

"اس کے ساتھی ناگر کی مصنوعی خود کشی کے متعلق تو ہاتھی چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ڈاکٹر نارنگ اسے کسی حال میں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ اس کا طریقہ شروع ہی سے یہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کے متعلق یہ محسوس کر لیتا تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائے گا تو وہ اسے زندہ ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مسٹر کیو کا نام بھی پرداز ہی میں رہے۔ بہر حال میری

کیا کہ ایسی صورت میں کسی ایک جگہ رہنا نہیں تھا۔ بھی میں شہر ہی تک مدد و تھا کہ ساجد اور ناگر کے تجربات کا علم ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر کیو پر ہاتھ ڈالنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی مجرموں کا روں ادا کرنے کے اس تک پہنچوں۔ کچھ ایسے جرام کروں جو مسٹر کیو کو اپنی طرف متوجہ کر لیں اور وہ مجھے بھی بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کرے۔ میں اسی ادھیر بن میں مصروف ایک شام راجروپ مگر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک کار اٹھی ہوئی کار پر نظر پڑی۔ وہ غالباً ایک درخت سے نکلا کر اٹھی تھی۔ وہ سڑک عموماً ویران ہی رہتی ہے۔ اس لئے شاید ابھی تک کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس کار میں مجھے جیس ایڈ جعفری کا جزل نیجر جعفری دکھائی دیا جو بہت زیادہ زخی ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ بس اسی وقت اچانک میری اسکیم مرتب ہو گئی۔ جعفری دیکھنے میں خاصا ڈراوٹا معلوم ہوتا ہے اور کچھ خبطی سا بھی ہے۔ شہر میں نہیں رہتا۔ دیہاتوں اور غیر آباد مقامات پر اس نے چھوٹے چھوٹے مکانات بنوار کئے ہیں۔ انہیں میں اس کا قیام رہتا ہے۔ میری اس کی یونہی رسمی ملاقات تھی۔ میں نے سوچا اس سے کام لیانا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے اسے الٹی ہوئی کار سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور راجروپ مگر کی طرف بروانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے جعفری کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر شوکت کے پردو کیا اور اسے ساری باتیں سمجھادیں۔ مجھے تو قع بھی تھی کہ جعفری کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا اور یہی ہوا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر شوکت ہی کا مہمان رہا۔ بہر حال اس کے دفتر میں کسی کو میرے متعلق ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہوا اور دھیان ہی کیوں دیتا۔ دفتر والے تو اس سے لرزتے ہی رہا کرتے تھے۔۔۔ پھر میں نے رشیدہ کو اس کے دفتر میں جگہ دی۔ شروع ہی سے ارادہ تھا کہ اپنے جرام کے ذریعہ رشیدہ ہی کو بناوں گا۔ اسے اس کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا کہ وہ فریدی جس نے اسے وہاں ملازمت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ خود ہی جعفری بھی ہے۔ اس طرح اس کے دل میں بناوٹ نہیں ہونے پائی۔۔۔ جس دن دفتر کی تلاشی ہوئی اسی دن میرا نام مسٹر کیو کی لست میں آگیا۔ اس کے آدمی میرے متعلق اور زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔۔۔ اس کے گروہ کی ایک لڑکی کنوں نے اس کا پتہ لگایا تھا کہ اس تلاشی میں رشیدہ ہی کا ہاتھ تھا۔ بہر حال میں رشیدہ کو لے اڑا۔ مسٹر کیو کا کوئی آدمی میری کار کا تعاقب کر رہا تھا میں نے اس کا ایک ناٹر پھاڑ دیا۔ محض اسے نیا باور کرانے کے لئے ک

احتیاط سے اتنا تو ہوا کہ ناگر بخاگیا۔ لیکن مسٹر کیو کو اس کی خود کشی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے خود ہی اپنا نام اپنے ہی ذریعہ سے ظاہر کر دیا۔ اس میں بھی اس کی ایک گہری چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہر طرح کے شہابات سے بالآخر ہے۔ جو نکل سب سے پہلے اس کا دبی بندگ مکہ سراغِ رسانی کے ایک فرد سجن حمد کو مشتبہ معلوم ہوا تھا اس لئے اس نے ہر طرح سے اپنی صفائی ضروری سمجھی اور میں تو ہیاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر حمد کو اس بندگ میں وہ جادو شہ پیش آیا ہو تا تو ہم آج بھی ان سارے جرام کی رو جرواں سے نادافع ہوتے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے ساتھیوں کی اس حماقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اتنے پاپڑ بیلے کہ اس سے غلطیاں ہی سرزد ہوتی چلی گئیں اور نتیجے کے طور پر اسے قانون کی گرفت میں آ جانا پڑا۔۔۔ ہاں تو۔۔۔ کرنل فرید کے سیکریٹری ساجد اور نارنگ کے ساتھی ناگر کے بیان سے مجھے اس کے طریقہ کار کا علم ہوا جو بڑا عجیب تھا۔ وہ ایسے مجرموں کو بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لیتا تھا جن کے جرام سے پولیس بھی لا علم ہوتی تھی اور اس کے لئے وہ سیکرٹ سروس والوں کا ٹرا نسمری استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے ساتھیوں کے لئے بھی معہ بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ چیز بھی ان کے ذہن نہیں کرداری تھی کہ اگر ان میں سے کسی نے کبھی مسٹر کیو کی شخصیت کار از معلوم کرنے کی کوشش کی تو شتم کر دیا جائے گا اور اس نے کئی آدمیوں کے ساتھ یہی بر تاؤ بھی کیا۔ صرف ساجد ہی ایسا تھا جو بخی گیا۔ وہ بھی اگر پاگل خانے کی راہنہ لیتا تو اس کی زندگی بھی ناممکن تھی۔

”بھی۔۔۔ وہ جعفری والا واقعہ۔۔۔“ ذی۔۔۔ جی۔ مغضطربانہ انداز میں بولا۔

”اسی کی طرف آرہا ہوں۔“ فریدی نے مسکراتے ہوئے تقریب جاری رکھی۔ جب مجھ پر اور حمد پر حملہ ہوا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ روپوش ہو جائیں۔ مجھ سے دراصل ایک زبردست غلطی ہوئی تھی۔ اس ماںکر و فون والے واقعہ میں بھی مجھے رازداری ہی بر تی چاہئے تھی۔ بہر حال مجھ پر وہ حملہ ڈاکٹر نارنگ کی جلاہٹ ہی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح میں نے اس کا ایک سمجھی العقول حرہ قطعی بیکار کر دیا تھا۔

”وہ اڑنے والی رانقل کہاں ہے۔“ متعدد آوازیں آئیں۔

”ابھی تک نہیں یہ آمد ہو سکی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں بتا۔۔۔ بہر حال میں اپنی روپوشی کے لئے کسی اچھی سی جگہ کی تلاش میں تھا اسی دوران میں میں نے فیصلہ

میں اُسے پولیس کا کوئی آدمی سمجھا ہوں۔ جس مکان میں رشیدہ کو لے گیا تھا وہ جعفری ہی کا ہے اور ایک غیر آباد مقام پر واقع ہے۔ میں نے کئی دنوں سے وہیں بودو باش اختیار کر کی تھی اور برابر یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ لیکن میں ظاہر ہے پردا نظر آتا رہا۔۔۔ ہال تو جب میں رشیدہ کو باندھ رہا تھا تو ہم پر ایک تیز قسم کی روشنی پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی فلیش کیبرے کی ہے۔ اس پر میں نے چینچ چلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی پولیس والے کو حرکت تھی۔ میں نے عذر ارشیدہ سے ساری گفتگو اونچی آواز میں کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اسے مشریک کے آدمی نہ اٹھائے جائیں۔ کیونکہ انہیں کسی ایسے آدمی کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو فریدی کا پتہ اور نشان چاتا ہو۔۔۔ دوسرے دن صبح ہی میں نے رشیدہ کو بے ہوش کر کے ایک ٹرک میں ڈالا اور اس کے اوپر پیال لاد دی۔ اس طرح اسے بھی راجروپ گلر پہنچایا اس وقت میں جعفری کی شکل میں نہیں تھا۔ مگر ان کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے میدان صاف تھا۔۔۔ دوسرے دن آفس میں مجھے وہی تصویر ملی تھی میں نے بعد میں انور کو سمجھ دی تھی۔ تصویر کے ساتھ ہی مشریک کا ایک دھمکی آمیز خط بھی تھد اس نے لکھا تھا کہ اگر میں اس کے گروہ میں نہ شامل ہو اور اس کے احکامات کی تعییں تکی تو“ تصویر پولیس کے حوالے کر دی جائے گی۔ میرا جواب اس نے ایکسپریان جگہ پر مانگا تھا۔ میں نے جواب لکھ کر وہاں رکھ دیا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ جس کے ذریعہ اس نے مجھے کئی جرائم کی ترغیب دی۔ بہر حال میں پیغام رسائی کے طریقے کاراز جانے کا کوشش رہا۔ پھر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کے خطوط کمی ہاتھوں سے گزرتے ہوئے مجھے سملک تھیتھی ہیں۔ اسی طرح وہ خط بھی کمی ہاتھوں سے گزرتا ہوا ساگر میشن تک پہنچا تھا اور پھر وہاں سے اسے کوئی ناس سر کبوتر ڈاکٹر نہ گت تک پہنچا دیتا تھا اور ڈاکٹر نارنگ کا نائب کیا ہوا خط کبوتر ہی کے ذریعے ساگر میشن تک پہنچتا تھا مجھے کئی دنوں تک ان کبوتروں کا تعاقب کرنا پڑا تب جا کر یہ راز کھلا کر وہ ڈاکٹر نارنگ کی کوئی پر اترتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی کئی راتیں چوروں کی طرح ساگر میشن اور نارنگ کی کوئی کمی کی خلافی لینے میں صرف کیس اور جب مکمل طور پر اس بات کا یقین ہو گیا کہ اصل مجرم نارنگ ہی ہے تو میں نے وہ تصویر انور کو سمجھ دی۔ جب جعفری کے دفتر کی طلاقی ہو رہی تھی تو اس وقت میں سرک ہی پر موجود تھا۔ لیکن دوسرے بھیں میں۔ ذی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر میں نے انہیں ڈاکٹر

نارنگ کی طرف سے فون کیا۔۔۔ اور پھر جو کچھ بھی ہوا آپ جانتے ہیں۔“
تمام واقعات صاف ہو چکے تھے لیکن لوگ نارنگ کا بیان سننے کے لئے بے تاب تھے۔ جس دن عدالت میں ڈاکٹر نارنگ کا بیان ہونے والا تھا کہیں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ صرف خواص ہی کا داخلہ ہو سکا تھا۔ عوام سڑک پر اور عدالت کے صحن میں بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ نے بڑی شرافت سے استدعا کی تھی کہ باہر والوں تک اس کی آواز بچنے کے لئے مانگو فون کا انتظام کیا جائے۔ پہلے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی لیکن جب اُس نے اس بات کا یقین دلایا کہ ملک کے مفاد کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہے گا تو درخواست منظور کر لی گئی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کوئی ایسی بات شروع کرے تو مانگو فون کا سلسلہ منقطع بھی کیا جاسکتا ہے۔۔۔ بڑی عجیب درخواست تھی۔

نارنگ قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے میں بیٹھا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تدرست نظر آ رہا تھا۔ چھرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں عجیب طرح کی چک نظر آ رہی تھی۔ جب وہ اپنی بیان دینے کے لئے کھڑا ہوا تو عدالت میں ستانچا گیا۔ پھر حلف دینے کی رسم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کسی موہوم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں میں جو کچھ بھی کہوں گا کچھ ہی کہوں گا۔ البتہ میں بتتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں۔ کیونکہ خون ریزی ہی میرا مذہب رہا ہے۔ توگ میرے جرام کا مقصد جانے کے لئے بے تاب ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو مقصد کسی مذہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خونریزی کا بھی تھا۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے اور میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں مخف اس لئے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرای قرار دیا تھا۔

حرای اہاں میں حرای ہوں۔۔۔ میری سبیل گی پر کئی منہ جیرت سے کھل گئے ہیں۔۔۔ کچھ مگر اب بھی رہے ہیں اور آزر میں چیف جسٹس یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید اب میں پاگل پن کا ڈھونگ رچانے جا رہا ہوں۔ اپنے کپڑے پھاڑاں کا اور پھر اس وقت تک پچانی سے پچار ہوں گا جب تک مجھے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑے گا۔۔۔ نہیں میں باہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ میں حرای ہوں۔ میں اپنی ماں کی شادی کے نٹیک پانچویں میئنے میں پیدا ہوا تھا۔ اس سانچے پر اس نے تو خود کشی کر لی تھی لیکن وہ شخص جس سے اُس کی شادی ہوئی تھی۔۔۔ میں اس کا تذکرہ اتنے عامیانہ

کہتے ہیں کہ حرای ہر حال میں مرنے سے قبل خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے پڑے حرای کو رواہ مستقیم سے بھی محروم کر دیا گیا۔ پھر آخر کیا کرے کہاں جائے۔ بتاؤنا... بلو... جواب دو۔“

ڈاکٹر نارنگ خاموش ہو کر مجھ کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کوئی نہیں بولے گا۔“ اس نے زہر خند کے ساتھ تقریر پھر شروع کر دی۔ ”میں بہت آگے بڑھ آیا۔ لوگ یہ جانے کے لئے بیتاب ہوں گے کہ ایک حرای ایم۔ پی کیسے بن گیا۔ اسے یہ حق کس طرح حل گی۔ میں انہیں مایوس نہ کروں گا۔ ہاں تو میں اس ہوٹل سے فرار ہو گیا اور یہ تھیہ کر لیا کہ کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں مجھے کوئی جانتا نہ ہو۔ میں اس میں آج تک کامیاب رہا۔ میں نے گھٹیا سے گھٹیا مزدوریاں کیں مگر تعلیم نہ چھوڑی۔ سیاست میں ایم۔ اے کرنے کے بعد میں باقاعدہ طور پر میدان سیاست میں اتر آیا تکن وہ حرای والا کو مپلکس اب بھی مجھے بے چین کئے ہوئے تھا۔ مجھے آدمی سے نفرت تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں حرای ہوئے تھا۔ ہوں تو ساری عظمت آن کی آن میں ڈھیر ہو جائے گی۔ جھنگلاتھ نے میری خون کی پیاس بڑھا دی۔ کسی بھی آدمی کو بے بس کر کے مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ میں ایک ایسے مبارک وقت کے خواب دیکھا کرتا تھا جب ایک ایسی قوت میرے ہاتھوں میں ہو کر لوگ اس کے آگے بے بس ہو کر رہ جائیں۔ مجھے اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو لوگوں کو خوفزدہ دیکھنا چاہتا تھا۔ زخمیوں کی کراہیں اور سرنے والوں کی بچکیاں سننا چاہتا تھا۔ میں حرای تھا اسلئے خود کو جہنم کا مستحق بنا رہا تھا۔ جہنم....!“

نارنگ نے رک کر قہقهہ لگایا۔ ”جہنم.... کیا شہر اس دوران میں جہنم نہیں تھا کیا میں اس جہنم کا مستحق ہرگز نہ بنت۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے نیک اور شریف آدمیوں میں کم از کم پانچ فیصدی حرای ضرور ہوں گے لیکن وہ اس لئے قابل نفرت نہیں ہیں کہ ان کی ماوں نے انہیں یہ نہ بتایا ہو گا کہ وہ حرای ہیں۔ لہذا وہ سو فیصدی بہشت کے مستحق ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ کی آواز دھمی پڑ گئی اور وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں نے اپنے جرام کا اعتراف کر لیا ہے اور ابھی میں بعض مضمکہ خیز قسم کے فیصلے سنوں گا۔“

”آرڈر.... آرڈر....!“ مجھ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

”میں اب بھی وقت کا سب سے بڑا آرڈر ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ نے قہقهہ لگایا۔ ”اس مقدمے

انداز میں کر کے اس کی توبین کر رہا ہوں.... وہ دنیا کا عظیم ترین شخص تھا میں تو اسے خدا نک کہنے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے مجھے اپنے بیٹھے کی طرح پالا اور پھر دوسری شادی نہ کی.... ہوش سنجھاتے پر مجھے یہ سمجھایا گیا کہ حرای کہتے کے ہیں.... میری ماں کا شوہر اس پر جھنگلاتا اور اپنی بوٹیاں نوچتا۔ گاؤں بھر سے اس نے دشمنی مول لے لی لیکن پھر بھی وہ میرے لئے دوسرے سے لٹا رہا۔ عورتیں اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھینے سے روکتی تھیں میں بچپن ہی سے بڑا حساس تھا۔ مجھ پر عرصہ حیات نگہ ہو گیا۔ پکھے اور بڑا ہوا تو سوچنے لگا کہ آخر حرای ہوتے میں میرا اپنا کیا صورت ہے۔ میرے پالنے والے نے نگہ آکر مجھے شہر کے ایک ہوٹل میں بھیج دیا۔ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ لکھتے پڑھنے میں دل زیادہ لگتا تھا۔ میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن وہاں بھی مشکل سے ایک ہی سال سکون سے گزار پا لیا۔ دوسرے سال اسی ہوٹل میں میرے گاؤں کے دو ایک لڑکے اور بھی آگئے۔ مجھے بھروسہ ہی آوازیں سنائی دینے لگیں.... ”ڈاکٹر نارنگ، ایک لٹکے کے لئے رکا۔ عدالت میں سنائا چاہیا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے کو گھور تارہ پھر گرج کر بولا۔ ”مجھے بتاؤ میں کیا کرتا۔ مجھے جواب دو؟ اگر کوئی مادرزاد لنگڑا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مادرزاد اندھے ہندوؤں میں سورہ اس اور مسلمانوں میں حافظ کہلاتے ہیں.... لیکن میں.... کیا میں بذات خود ایک بہت بڑی مجبوری.... نہیں تھا، کیا میں ایک بیماری کی طرح نہیں پیدا ہوا تھا۔ اگر میں شاستر پڑھ لیتا تب بھی حرای ہی رہتا۔ اگر قرآن بھی حفظ کر لیتا تو لوگ مجھے حافظ کہتے ہوئے بچکھاتے۔ آخر کیوں! کیا میں بھی ایک لنگڑے یا اندر ہے کی طرح اپنی پیدائش کے معاملے میں بے بس نہیں تھا.... زانی اور زانیہ اگر تائب ہو جائیں تو خدا ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن میں تمہارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ آخر اس نے حرای کو کیوں اپنے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے.... وہ جس کا میں نظر نہیں ہوں گا وہ اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا تو لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سورگ کی آس لگائے بیٹھا ہو گا.... لیکن.... میں.... میں کس طرح خود کو بدلتا ہوں۔ میں حرای ہوں۔ کوئی عادت نہیں ہوں کہ بدلتا جاؤں.... میں باضی.... حال.... اور مستقبل تینوں سے محروم ہوں۔ حال حاضر اس لئے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے تو.... میں اس سے بھی مایوس ہوں کیونکہ بعض مذاہب حرای کو ہر حال میں جہنمی قرار دیتے ہیں

کے دوران میں میں نے کئی بار عدالت کی توہین کی ہے۔ اس لئے پھانسی کے ساتھ توہین عدالت کے سلسلے میں چھ ماہ کی سزا ضرور رکھی گئی ہو گی۔ لہذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ پھانسی کے بعد ہی مجھے چھ ماہ کی سزا قید دی جائے۔“

حاضرین کے قہقہے کی طرح رکنے سکے۔

عدالت نے پھر میز پر موگری بجانی شروع کر دی۔

عدالت برخواست ہونے پر فریدی بہت زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ حمید کے چھٹرنے پر آہستہ سے بولا۔

”اگر یہ غلط راستے پر نہ نگل گیا ہو تو برا عظیم آدمی ہوتا۔“

”اوہ نہ...!“ حمید نے بُراسامنہ بنایا۔ ”کنوں کا کیا رہا۔“

”وہ اور ناگر سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں! ظاہر ہے کہ بری ہو جائیں گے۔“
”وہ را کُفل نہ جانے کیا ہوئی۔“

”کیا تم پچھلی کارروائیوں کے دوران سوتے رہے ہو۔ اس نے اسے اسی وقت تباہ کر دیا تھا جب میں نے ماسکر دفن کے اثناء کے لئے آرڈر نکلائے تھے۔“

ڈاکٹر نارنگ کی پھانسی کا منظر بھی عجیب تھا جنہوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ وہ گوشت و پوست کا آدمی تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا ضمحلال کی جگہ شلگنگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھنے کا ذکر کر بولا۔ ”پوچھنے سے کیا فائدہ جبکہ پوری ہی نہ کی جاسکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موجود ہیں انہیں بڑے بے دردی سے قتل کر دوں۔ آخری خواہش پوچھنے کا ذکر حکومتہ بھی عجیب ہے! اچھا خیر چلو! اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے مرنے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حراثی نہیں ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھڑا اس مجھے کو دیکھتا رہا جسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک زہریلا ساقہ قہقہہ لگایا اور بلا تکان پھانسی کے تنخے پر چڑھ گیا۔

ختم شد